فصل دوم

ورلڈ کانگرس آف فیملیز II

۱۴ تا ۱۷ نومبر ۱۹۹۹ء کو جنیوا سوئٹزرلینڈ میں ۲ ہزار سے زائد ایسے افراد کی عالمی کانگرس ہوئی جو خاندان کے روایتی تصور کو اِس روئے زمین پر امن و آشتی اور اخلاق کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لیے لازم سمجھتے تھے۔ اِس کانگرس میں بحث ومباحثے کے بعد بنیادی اصولوں کی ایک دستاویز تیار کی گئی جسے میں اُردو میں ترجمہ وتلخیص کر کے اپنے مقالے میں پیش کر رہی ہوں۔ یہ دستاویز اقوامِ متحدہ میں استعمال ہونے والی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کی گئی اور اِس کے ذریعے روایتی، فطری خاندانوں کے ذریعے صدیوں کے آزمودہ خاندانی اقدار پروان چڑھانے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ اِس دستاویز پر کئی مذاہب جن میں اسلام، یہودیت اور نصرانیت کے ماننے والوں اور کئی تہذیبوں کا اتفاق روبہ عمل لایا گیا اور اسے اقوام متحدہ کی پالیسی پر طویل عرصے تک اثر پذیر رہنے کے لیے قابلِ قبول بنایا گیا۔

ورلڈ فیملی پالیسی فورم کی کیتھرین بالمفورتھ نے اِس کانگرس میں بڑی اہم بات کی کہ ''خاندان دشمن قوتوں نے انسانی حقوق کے تصور کو ہائی جیک کرلیا ہے تاکہ اِسے مذہبی، تہذیبی اور خاندانی اقدار اور حقوق کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ خاندان دشمن قوتوں کا کہنا ہے کہ خاندان اور مذہب عورتوں کے لیے ظالمانہ ہیں۔ ایسا کوئی بھی اقدام جس کے ذریعے خاندانوں کا دفاع کیا جاسکے اور والدین کو اجازت مل سکے کہ وہ اپنے بچوں کو آزمودہ اقدار سکھا سکیں' ظالمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری زندگیوں سے کافی دُور اور مضحکہ خیز محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اقوام متحدہ کے معاہدے اور دیگر دستاویزات اور دیگر حربے جنھوں نے اِن سے جنم لیا ہے وہ قومی اور بین الاقوامی سیاست اور پالیسی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔'' بالم فورتھ کا یہ بھی کہنا تھا کہ ''اقوام متحدہ کے نظام کو دھوکا دہی سے بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاندان کے حمایتی گروپ اور افراد مقامی، ریاستی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر تعمیری حصہ دار بنیں اور اقوامِ متحدہ کے خاندان کے حمایتی وفود، کانگرس کے نمائندوں اور فطری خاندان کے بقا کے لیے کام کرنے والوں کے دست و بازو بنیں۔''

اِس کانگرس میں اِس ضرورت پر زور دیا گیا کہ اِس دستاویز کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اِس پر عمل درآمد کا مربوط پروگرام بنایا جائے اور معاشرے کے بنیادی یونٹ خاندان کو محفوظ رکھنے کے لیے مقامی یا بین الاقوامی طور پر اپنے کردار کو ادا کیا جائے۔

کانگرس نے ورلڈ فیملی پالیسی فورم کے ڈائریکٹر رچرڈ ولکنز اور ہاورڈ مرکز برائے خاندان، مذہب اور معاشرہ کے صدر جناب ایلن کارلسن اور اُن کے معاونین کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اِس کانگرس کے لیے جنرل سیکرٹریٹ کا کردار ادا کیا۔

تحفظِ خاندان امن کے فروغ کی ضمانت ہے

جینوا میں ورلڈ کانگرس آف فیملی کے افتتاحی سیشن سے انور سادات کی بیوہ جیہان سادات نے اپنے خطاب میں کہا

کہ فطری خاندان کے تقدس پر روز افزوں،مختلف سمتوں سے تابڑ توڑ حملے ہورہے ہیں، نتیجتاً آئندہ صدی میں فطری خاندان کے وجود کے بارے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ میری دانست میں اسکالرز اورعوام الناس روایتی خاندان کے انحطاط کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ اس کو سمجھنا اتنا مشکل نہ ہوگا اگر ہم غربت، ناخواندگی اور تیزی سے ظہور پذیر ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کا والدین اوران کے بچوں پر بڑھتے ہوئے دباؤ کا صحیح جائزہ لے سکیں۔

گوکہ میں سب باتیں سمجھتی ہوں لیکن میں اِس بات سے اتفاق نہیں کروں گی کہ خاندان گھسی پٹی اچھائیوں اور اقدار کی ایک یادگار بن گیا ہے، جس کا جدید معاشرے میں عمل دخل نہیں۔ آج کا خاندان عین بالکل پہلے کی طرح حضرت آدمؑ اور بی بی حواؑ کے دور سے آج تک کے معاشرے کا ایک بنیادی جُز ہے۔ انسانی حیات کے فروغ اورترقی میں اب بھی روایتی خاندان کا کردارمنفرد ہے۔ خدا کے بغیر انسانیت بھٹک جاتی ہے اور مایوسیوں کے اندھیروں میں گم ہوجاتی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ یا برادری مستحکم ہونے کی اُمید نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ خاندانی رشتے باہمی پیارومحبت، اعتماد، تعظیم وتکریم کی بنیاد پر آپس میں جڑے نہ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتو ایسے معاشرے کی ترقی اورخوش حالی کا جو بھی درجہ ہو وہ معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔

ہمارے ہاں مصر میں خاندان ہی زندگی کا محور ہیں جس کی نشان دہی ہمارے عجائب گھر اور قدیم مندروں کی دیواروں پر بنی روزمرہ زندگی کی تصاویر سے بھی ہوتی ہے۔ ہمارا پس منظر زرعی اور دیہاتی ہے۔ جس نے ہمیں زمین اور خاندان دونوں سے مضبوط رشتوں سے جوڑا اور جس کے نتیجے میں ہمارے اندر معاشرتی ذمہ داریوں کا گہرا احساس پیدا ہوا' جس کا مظاہرہ ہم عصرحاضر میں اپنے ہاں دیکھتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جنم لینے والا شخص دوسروں کی زندگی سے غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔ مصر میں ایک کہاوت ہے: ''انسانوں کے بغیر جنت چہ معنی''۔

جب کوئی مصری باشندہ خاندان کی بات کرتا ہے اُس میں والد، والدہ، بچے، خالائیں، پھوپھیاں، چچا، ماموں، بھتیجیاں، بھتیجے، بھانجیاں، بھانجے اور بیسیوں کزن شامل ہوتے ہیں۔ ہر رشتے کی دل کھول کر پذیرائی ہوتی ہے۔ خواہ کسی کا کوئی امیر چچا یا ماموں جو قاہرہ دارالحکومت میں رہتا ہو یا کسی کا دُور کا غریب کزن ہو جو اسوان میں قیام پذیر ہو۔ ہم اپنے آپ کو ایک بڑا خاندان سمجھتے ہیں۔

مصر لگاتار ترقی کررہا ہے۔ اس سے خاندان کی رسومات فطری طور پر تبدیل ہوں گی، مگر ہم زمین اور خاندان کو مکمل طور پر ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ دنیاوی تبدیلی ثقافتی رسومات کے نقصانات کے بغیر بھی ممکن ہے یا پھر اخلاقی گراوٹ کے ساتھ ترقی کی ضرورت ہے۔ یہ ترقی نہیں ہے جو روایات اور اخلاقیات کو تباہ کرکے ملے۔ بلکہ مضبوط اخلاقی اقدار کی غیر موجودگی اس تباہی کا باعث ہے اور یہی مضبوط اخلاقی اقدار کی غیر موجودگی اِس تباہی کا باعث ہے اور یہی مضبوط اخلاقی اقدار خاندان کے وجود کی بنیاد ہیں۔ ہم اپنی اقدار کھوئے بغیر جدید دور کی تمام تر سہولیات جن میں ہوائی جہاز، گاڑیاں، کمپیوٹر اور موبائل فون شامل ہیں سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یقیناً ہم اپنی اچھی روایات چھوڑے بغیر بھی اپنے خاندان اور اپنے خدا سے پیار کرسکتے ہیں اور جدید زندگی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

قرآن پاک میں اِس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے طریقۂ کار

وضع کیے گئے ہیں۔ بالخصوص والدین سے اچھے سلوک کے بارے زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے والدین کا حکم مانیں، اُن کی عزت کریں اور اُن سے پیار کریں۔ انکساری اور نرم رویہ اپنائیں، والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد پہلا درجہ رکھتا ہے۔ ماؤں کا تو مقام ہی اور ہے۔ ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضورؐ سے پوچھا کہ اے اللہ کے نبیؐ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: آپ کی والدہ۔ یقیناً مائیں ہمیں نہ صرف زندگی دیتی ہیں بلکہ ہماری سب سے پہلی استاد بھی وہی ہوتی ہیں جو ہمیں زندگی کی بیش قیمت اقدار سکھاتی ہیں جو ہماری زندگی کے رہنما اصول بن جاتے ہیں۔

حضورؐ کا فرمان ہے کہ ''ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے''۔

دین اسلام نے ازدواجی زندگی میں رویوں پر بھی اصول وضع کیے ہیں۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ اس لیے ازدواجی زندگی میں امن، رحم دلی اور حلیمی کے ماحول پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں فرمان ہے کہ بیوی آپ کا لباس ہے اور آپ اُس کا لباس ہیں۔

قرآن پاک کے اس فرمان کے معنی یقیناً یہ نہیں ہیں کہ کسی کی بیوی یا شوہر کوئی ایک پسندیدہ لباس کی سی معمولی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شریکِ حیات کو دوسرے کا تحفظ کرنا چاہیے اور غلطیوں کی پردہ پوشی کرنی چاہیے۔ میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کی خامیاں اُجاگر کرنے کے بجائے ایک دوسرے کا خیرخواہ ہونا چاہیے۔

ازدواجی زندگی کی بنیاد کی آبیاری وفاداری اور محبت سے کی جاتی ہے جو وقت کے تجربات اور مشاہدات سے مضبوط تر ہوجاتی ہے۔ میاں اور بیوی کو خاندان کے امن اور خوشی کی خاطر مل جل کر کام کرنا چاہیے۔

خاندانی اقدار پر میرے شوہر نے یوں لکھا تھا:

> ''میں کبھی اپنے خاندان سے وفاداری میں کمی کا تصور نہیں کرسکتا کیوں کہ یہ میری روایات اور اقدار کے منافی ہے۔ انھی اقدار سے میرا وجود ہے اور میری ذہنی کیفیت میں ان سے بڑھ کر کسی اور چیز کا عمل دخل نہیں۔ بے شک اِن اقدار میں میرا یقین دن بدن بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ میں اب سمجھتا ہوں کہ انھی اقدار کی پاسداری سے معاشرہ بڑھ سکتا ہے''۔

میں دنیا کے کسی کونے میں چلی جاؤں، مصر میری روح میں سمایا ہے اور میرا خاندان میرے دل کی دھڑکن ہے۔ میرے بچوں، بچوں کے بچے اور انورالسادات نے مجھے جو پیار دیا ہے میرا دل اُسی سے خوشی اور طمانیت سے معمور ہے۔ آخر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ خاندان کی حفاظت اللہ کے احکامات کی تعمیل ہے اور امن کے فروغ کا باعث ہے، جو زندگی میں خوشیاں لاتا ہے۔

چند اہم شخصیات کی رائے:

میڈم کرسٹینی دی ولمر جو لاطینی امریکا کے اتحاد برائے خاندان کی صدر ہیں، فرماتی ہیں کہ ایک خاندان کو غیرمشروط طور پر ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے جو بچوں کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ مخلص ہوں۔ کسی ایک رشتہ میں غیرمشروط

ہونا اور مخلص ہونا دو مختلف موضوع ہیں۔

مشترکہ خاندان، خاندانی امن جس طرح مرضی ملا کر دیکھیں ایک گھمبیر مسئلہ ہے۔ ہمارے زمانے میں جب جذبات حاوی تھے، جوش، نئے ولولے، نئے خیالات جو پکار رہے تھے جذبات کے لیے، خلوص کے لیے اور جذبہ و جوش کی آزادی کے لیے، خلوص جو کہ اب قسمت کی دیوی بن چکی ہے نا صرف یہ کہ تعریف نہیں کی جاتی، پسند نہیں کیا جاتا اور سمجھا بھی نہیں جاتا۔ خلوص کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی، حتیٰ کہ اس کی مختلف طریقوں سے تذلیل کی جاتی ہے۔

عزت مآب کیلون اینڈریو (Barrister Member Australian Federal Parliament) دنیا کے مختلف حصوں سے عوامی نمائندے اور پالیسی بنانے والے اب یہ بات سمجھنے لگے ہیں کہ سماجی، ثقافتی اور اقتصادی اہمیت زندگی بھر ازدواجی زندگی اور صحت مند خاندان کے لیے کتنے ضروری ہیں۔

تاہم زیادہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ یہ پالیسیاں پوری دنیا میں کیسے پھیلائی جائیں، ہمارا نقطۂ نظر بہت واضح ہے۔ ہمارے ہاتھ مایوسیوں کے لیے کھلے ہیں، اندھیرے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خاندانی نظام کو ٹوٹتے دیکھنا اور شرح پیدائش میں کمی کے حل کے لیے راستوں کی تلاش دونوں میں ناکام نظر آتے ہیں۔ جتنے بھی مسائل کا حل بظاہر مایوس کن نظر آتا ہے یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم ایک مثبت قدم آگے بڑھائیں تو بہت سے لوگ ہمارے ساتھ ہولیں، تاکہ اس مسئلے کے حل کے لیے بہت سے لوگوں کا ساتھ بانٹا جائے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ عملی طور پر مسلسل حوصلے کے ساتھ ہم ایک مضبوط معاشرہ بنا سکتے ہیں جو کہ ایک صحت مند معاشرہ ہو، جس کی بنیاد ایک مستحکم خاندان ہو۔

محمد جاوید سہلانی، پی ایچ ڈی: میاں بیوی کا ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رہنا کہ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ہو اور دوسرے کی خوشی میں خوش ہو، اپنی ذات کی نفی کرے دوسرے کی خوشی کی خاطر۔ حقیقتاً میاں بیوی کا اکٹھا رہنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے بہ نسبت اس کے کہ صرف جذباتیت سے کام لیا جائے۔

کیتھرائن بام فورتھ جے ڈی (Director World Family Policy for USA): ورتھ لن سروے اِس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ غیر خاندانی تحریک جس میں بہت زیادہ جوش ہے وہ صرف اقوامِ متحدہ کے کچھ علاقے ہیں جو کہ بہت کم لوگوں کے خیالات کو اُجاگر کرتے ہیں اور بہت کم حکومتیں اِن کو سپورٹ کرتی ہیں۔ میری حکومت یعنی امریکی حکومت بھی اِن حکومتوں میں سے ایک ہے جو کہ اقلیت کے خیالات اور تصورات کی عکاسی کرتی ہے۔ اور اکثریت کی سوچ کو اپنانے سے گریز کرتی ہے۔ میری حکومت میں ایلیٹ کلاس کا وہ گروپ شامل ہے جن کی سوچ اقلیت سے ملتی ہے اور وہ غیر خاندانی تحریک کے حق میں ہیں۔

ایمی سٹیفن خاندانی نظام پر اظہار کرتے ہیں:

> ''تاہم یہاں ایک روشن خیال یہ ہے کہ سماجی نظام اگر ایک دفعہ ٹوٹ بھی جائے تو اِسے دوبارہ جوڑا جائے اور اِس خیال کے بارے میں بہت ساری وجوہات موجود ہیں جو کہ آج کل ہو رہا ہے۔ خاندان اور حکومتیں دوبارہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ خاندان معاشرے کی اقتصادی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ کام کرنے والی خواتین و مرد متبادل ذرائع ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ وہ خاندان بنا سکیں اور کام کو رشتوں میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔ کثیر الثقافتی معاشرہ پائیدار اصول بنانا چاہتا ہے کہ جس میں کوئی

بھی دوسرے سے یہ پوچھ سکے کہ وہ کیا اور کیوں کر رہا ہے؟ اِس کا جواب انسانی نفسیات ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر سماجی جانور ہے اور خاندان اِس کا بنیادی اور بہت اہم حصہ ہے۔''

خاندانی اصولوں کی وضاحت:

جنیوا قرارداد جس میں خاندانی نظام اور اس کے معاملات کے بارے بارہ پیرائے مختص کیے گئے ہیں، درج ذیل میں جو اصول بتائے جارہے ہیں وہ اس قرارداد کے ہر پیرائے کا پہلا جملہ پیش کرتے ہیں۔ قرارداد کو مختصر کردیا ہے۔ جو اُن لوگوں نے منظور کی جنھوں نے کانفرنس میں حصہ لیا اور یہ اقوامِ متحدہ کو پیش کی گئی جس میں دوسرے پالیسی بنانے والے ادارے بھی شامل ہیں جو دنیا کی آواز ہیں۔

۱- ہمارا مقصد:

ہم سب عالمی کانفرنس میں شامل ہوئے ہیں۔ مختلف قومیت کے، مختلف رواجوں کے، مختلف مذاہب کے اور ثقافتوں کے لوگ کہ انسانی فطری خاندان کے نظام کو مضبوط کیا جائے جو کہ خدا نے وضع کیا ہے۔ اور یہ سب ضروری ہے ایک اچھے مشترکہ معاشرے کے قیام کے لیے۔

۲- معاشرہ اور خاندان:

ایک فطری خاندان ایک بنیادی سماج کا بنیادی حصہ ہے جو کہ انسانی فطرت ہے۔ یہ خاندان میاں بیوی کے زندگی بھر کے بندھن سے جڑا ہے جس کو شادی کا نام دیا گیا ہے۔ خوبصورت معاشرے کی بنیاد ایک مستحکم خاندان ہے۔

۳- شادی اور خاندان:

ایک صحت مند خاندانی زندگی کی بنیاد شادی ہے جو ایک عورت اور مرد کے مابین تحفظ، خوشی اور روحانی بلوغت لاتی ہے جو زندگی بھر کے لیے ایک اٹوٹ رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔

۴- بچے اور خاندان:

ایک فطری خاندان ہی بچوں کو صحت مند ترقی پسند اور بہترین اقدار دیتا ہے۔

۵- جنسیت اور خاندان:

عورت اور مرد قدرتی طور پر ایک دوسرے کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ مرد اور عورت فطری طور پر ایک دوسرے کے لیے معاون کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اِن دونوں کے قانونی بندھن یعنی کہ شادی سے ایک خاندان تشکیل پاتا ہے۔

۶- تعلیم اور خاندان:

ماں باپ خاص طور پر اِس بات کے ذمہ دار اور حق دار ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی اقدار کے مطابق تعلیم دیں۔

۷- اقتصادیات اور خاندان:

اقتصادی پالیسی دونوں سماجی اور حکومتی سطح پر اِس بات کی احتیاط برتنی چاہیے کہ ایک خاندان کی معاشیات کو بڑھنے دیا جائے جو خاندان کی نشوونما کے لیے اچھا، حتیٰ کہ اقتصادیات کے لیے بھی اچھا ہے۔

۸- حکومت اور خاندان:

حکومتوں کو خاندان کی حفاظت اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے نہ کہ معاشرے کے بنیادی اصول کو غیر قانونی طور پر توڑنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۹- خاندان اور مذہب:

ماں باپ کو بنیادی حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دیں اور اخلاقیات سکھائیں۔ ان کو اپنے مذہب کے مطابق پروان چڑھائیں۔

۱۰- خاندان کی عزت کے لیے ایک پکار:

ہم تمام لوگوں، خاندانوں، تنظیموں اور حکومتوں کو ساری دنیا پر زور دینا چاہیے کہ اداروں اور فطری خاندانوں کی اور خاندانی نظام کی عزت کی جائے اور اِس نظام کی بڑھوتری میں اس کی حوصلہ افزائی کی جائے' ایک اچھے 'آج' اور روشن مستقبل کے لیے۔

ڈاکٹر مارگریٹ اوگولا کا خطاب

ڈاکٹر مارگریٹ اوگولا جو کہ کینیا کے خاندانی نظام کی ایسوسی ایشن کی ڈائریکٹر ہیں، نے جنس اور خاندان پر بہت اچھے خیالات پیش کیے جو کہ لفظ بہ لفظ یاد کرنے کے قابل ہیں۔

ہم جنسیت اور فطری خاندان کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں' اگر ہم افریقہ کے لوگوں اور ان کی اجتماعی قبائلی دانش کا مطالعہ کریں۔ انسانی تہذیب و تاریخ نے تجدید و انتقالِ زندگی کی مقوی طاقت پر قابو پانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں نہ صرف انسانوں پر مختلف پابندیاں عائد کی ہیں بلکہ عمل اختلاط کے بارے بھی کچھ اخلاقی اصول وضع کیے ہیں۔ میری تحقیق و فلسفہ ہمارے تحت الشعور میں موجود ایسی ہی فکری لہروں پر مبنی ہے اور بالکل اِسی طرح بہت سے افریقی باشندوں کی سوچ کے پیچھے ایسے ہی عوامل کارفرما ہیں۔

بنی نوع انسان کی فطری سوچ ہمیشہ اِس بات کی متقاضی رہی ہے کہ افزائش نسل کے فطری عمل کو اور سوسائٹی میں عملِ اختلاط کو غلط استعمال سے روکا جائے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں مسلمان اور عیسائی مذاہب کے زیر اثر افریقہ میں یہ سوچ پروان چڑھی کہ عورت اور مرد کے رشتے کو تقدس کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ نظریہ ماند پڑ گیا حتیٰ کہ ۱۹۶۰ء کے وسط تک عورت اور مرد کے درمیان شادی کے بارے اچھی سوچ بکھر کر رہ گئی۔ ایسا مغرب کے زیادہ تر اور مشرق کے کچھ خطوں میں ہوتا آیا ہے لیکن شاید اِس نئی سوچ کا اثر افریقہ میں سب سے زیادہ رہا ہے' جس میں مقامی قبائلی نظام کی نزاکتوں کا بھی دخل رہا ہے۔ اِس اثر کے اطلاق کے ساتھ ہی جنسی عمل کا تقدس بڑی تیزی سے پامال ہوگیا۔ نتیجتاً ہم نے باقاعدہ شادی کے بغیر بچے پیدا کرنا، شادی کا جلد ٹوٹنا، بچوں سے دُوری' یہاں تک کہ بڑے بزرگوں کی تنہائی جیسے کئی ایک واقعات دیکھے اور بہت سی جنسی بیماریوں نے جنم لیا۔

اب ہم اِس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ شادی کے پاکیزہ بندھن میں جنسیت کے تصور کا زوال کیوں کر آیا بلکہ شادی کا بندھن جو کبھی آفاقی قبولیت کا حامل تھا کیوں زوال پذیر ہوا؟

☆ سب سے بڑا قصور اِس ضمن میں مانع حمل ادویات اور اُن کی جارحانہ خرید و فروخت کا ہے' جنھوں نے بے وفائی

اور قبل از شادی جنسی تعلقات کی بنیاد فراہم کی۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ دھوکا وفریب رشتوں کو آہستہ آہستہ تباہ کر دیتا ہے اور اب تو یہ تباہی اتنی زیادہ پھیل چکی ہے کہ اس نے قوموں کی قوموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ایڈز جیسے موذی مرض کا پھیلاؤ بھی اِسی اخلاقی وجنسی پستی کا مرہونِ منت ہے۔

☆ دوسری بات یہ ہے کہ جنسی عمل کے بارے میں ماضی میں ایک بھرم تھا یا پُراسراریت تھی' وہ اب ختم ہوچکی ہے۔ بظاہر تو یہ صورت حال ٹھیک دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ جب سے جنسی عمل کا تقدس اور بچے پیدا کرنے کی اہمیت ختم ہوئی ہے' بگاڑ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اب وہی بات کہ یہ سب کچھ کس طرح کیا گیا۔ اس کے لیے پہلا حربہ اقدار سے پاک جنسی تعلیم کا تھا' جس کا دارومدار محض دو باتوں پر تھا: ایک یہ کہ حمل سے کس طرح سے بچاجائے اور دوسرا یہ کہ جنسی بیماریوں سے کیسے محفوظ رہا جائے؟ اس طرح کی جنسی تعلیم اخلاقیات اور ذمہ داری جیسے بنیادی عناصر سے مبرا ہوتی ہے اور زور صرف لحاتی ترغیب ورضا پر دیا جاتا ہے۔

☆ تیسری اہم وجہ ہے 'سیارہ ہالی وڈ'۔ یہ نام میری اپنی اختراع اور ہالی وڈ کی فلمی دنیا کے نام سے مستعار لیا گیا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہالی وڈ کی فلموں میں جنسی حِظ اور لطف ومزہ کے عناصر کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ برائیاں ہمیں حتمی اچھائیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتنی آسانی سے فلموں میں فلمی کرداروں کو آزادانہ جنسی فعل ادا کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے اور نوجوانوں کو گاڑیوں کی عقبی نشستوں پر بغل گیر ہوتے دکھایا جاتا ہے۔ غرض کہ بے حیائی اور بے حجابی کی حدیں پھلانگی جاتی ہیں۔ الیکٹرانک ذرائع یا انٹرنیٹ کے ذریعے فحش تصاویر اور لٹریچر پل بھر میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچایا جاتا ہے۔

☆ چوتھی اہم وجہ 'میں اور میرا' کا عنصر ہے۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ وفاداری اور خاندان ومعاشرے کی وسیع تر خیرخواہی کے روایتی تصورات اب ناپید ہوچکے ہیں۔ طلاق کو بھی اب خاصی پذیرائی حاصل ہورہی ہے۔ جیسے یہ کسی ناگزیر حق کی بات ہو۔ اِس کے برعکس ازدواجی زندگی میں باہم بات چیت، مستقل مزاجی اور سمجھوتے جیسی خوبیوں کو جبر کی علامت کے طور پر تشہیر کیا جاتا ہے۔

☆ پانچویں اہم بات یہ ہے کہ اب دنیا کے بہت سے ممالک میں چھوٹے کنبے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہم نے البتہ اِس تصور کو اپنے ملک کی قانونی دستاویزات میں سے خارج کر دیا ہے۔ کیوں کہ ہم والدین کے ذمہ دارانہ رویے کو فروغ دے رہے ہیں نہ کہ چھوٹے کنبے کے خیال کو۔

افریقی باشندوں کی ایک بڑی تعداد صرف اپنے خاندان میں سماجی تحفظ محسوس کرتے ہیں اور بچوں کا ہونا تو والدین کے باہم رشتے کو استحکام پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ دنیا میں آنے والا ہر بچہ شادی کے بندھن کو مزید مضبوط کرنے کی ایک اور نئی وجہ ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں البتہ صورت حال اس کے برعکس ہے اور بہت سے کنبے صرف ایک یا دو بچوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس طرح کے کم بچوں پر مشتمل کنبے کو ذمہ دارانہ پرورش کا علَم بردار کیسے کہا جاسکتا ہے۔

☆ چھٹی اہم بات یہ ہے کہ اکثر لوگوں کے دل میں غیرمعمولی توقعات میں اضافہ ہوا جس کی وجہ ٹیلی ویژن ہے۔ مرد

حضرات بعض اوقات رومیو، کیسانووا یا آرنلڈ شوارزینگر کو اپنا آئیڈیل مان لیتے ہیں یا پھر اپنی ذات میں گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ جب کہ خواتین بھی جریدوں اور اشتہاروں میں لڑکیوں کی نیم برہنہ تصاویر دیکھ کر متاثر ہوتی ہیں اور اُن ماڈلز اور اداکاراؤں سے زیادہ حسین اور جوان دِکھنے کی آرزو میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ میں جب میں ایڈز سے مرنے والے نوجوانوں کے زیادہ سے زیادہ تابوت دیکھتی ہوں تو بوڑھا ہونا ایک خوش نصیبی سمجھتی ہوں اور یہ حقیقت ہے جو بڑی تلخ ہے کہ افریقی ممالک میں اوسط عمر ۱۰ سے ۱۵ برس کم ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں جو بہت بڑا نقصان ہوا ہے ہم ایک بڑی ہستی کے تصور سے دُور ہوگئے ہیں۔ جس کے سامنے ہم اپنی حرکات وسکنات کے لیے جواب دہ ہیں۔ جب لوگ نعوذ باللہ یہ سوچنے لگیں کہ خدا کا وجود اب نہیں رہا تو وہ اپنی غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں اور تخیلاتی تصریحات کے حق میں بہانے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ جنسی محبت کا حُسن سچی محبت میں مضمر ہے۔ جس میں کردار کی پختگی اس محبت کو مزید پروان چڑھاتی ہے' خواہ راستے کتنے ہی دشوارگزار ہوں اور خواہ آپ کا شریکِ حیات آپ کی توقعات پر پوری طرح نہ اُتر سکے۔

یہ سچ ہے کہ جو شخص بھی پختگی سے پیار کرتا ہے، وہ انسان ہونے کے اعلیٰ منصب کو پالیتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جسے ہم وسیع تر اچھائی سے تعبیر کرسکتے ہیں' جو ہمیں پہلے سے بہتر انسان بنا سکتا ہے۔ ہم اگر اِس منزل کو پالیں تو لذت پسندی کی سوچ پسِ پشت چلی جائے گی خاص طور پر جب یہ غیر مشروط محبت کی شان وشوکت کے روبرو آئے گی۔[۱]

ایلڈر بروس سی ہیفن کا خطاب

ایلڈر بروس سی ہیفن نے کانگرس سے ''مامتا اور خواتین کا اخلاقی اثر ورسوخ'' کے موضوع پر اپنے خطاب میں کہا کہ انسانی حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد میں ایک روایتی خاندان جنیوا اِس خاندانی پالیسی کی بنیادی سوچ کا ذریعہ بنا۔ یہ بنیادی خاندان کے متعلق عالمی کانفرنس اِن تنقیدی نئی سوچوں کو جِلا بخشے گی اور ان کو ایک ہی بنیادی سوچ میں پروئے گی۔

اقوامِ متحدہ اور دیگر مقامات پر خاندانی پالیسی ساز اب محض متبادل یا غیر فعال خاندانی ماڈل پر زور دیتی ہیں۔ جب کہ روایتی خاندان ایک انحطاط پذیر نسل کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ جیسے کچھ مخصوص گروہوں نے ذاتی ایجنڈے نے اقوامِ متحدہ کے پالیسی ساز ایجنڈے کی جگہ لے لی ہے۔ روایات سے انحراف ایک قانونی قاعدے کا درجہ اختیار کرگیا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اب جب کہ جمہوریت پہلے سے کہیں زیادہ پھل پھول چکی ہے' اقوامِ متحدہ اس طرح کی بغاوت کی اجازت کیوں کردے۔ ویسے اقوامِ متحدہ کو دنیا کے گھروں اور خاندانوں سے غیر متعلق ایک غیر جمہوری فورم کہنا شاید غلط نہ ہوگا۔

البتہ میں ایک عرصہ سے اِس بات کا قائل رہا ہوں کہ اقوامِ متحدہ اقدار پر مبنی ایک ادارہ ہے۔ میں کئی سال قبل جنیوا میں بچوں اور انسانوں کے حقوق پر منظور شدہ قرارداد کا بے حد معترف ہوں لیکن اَب مجھ پر یہ بات آشکارا ہوئی ہے کہ آج کی اقوامِ متحدہ خاندانی زندگی کے بارے میں اپنی صلاحیت کھو چکی ہے۔ اِس بات کا انکشاف مجھ پر تب ہوا جب میں قانون کا پروفیسر تھا اور مجھ سے ایک ماہر قانون دان نے اقوامِ متحدہ کے بچوں کے حقوق کی کانفرنس ۱۹۸۹ء کے بارے رائے طلب کی گئی۔ Convention of Rights of Child (CRC)

۱۔ ریفرنس: مارگریٹ اوگولا ایم ڈی (میڈیکل ڈائریکٹر کینیا کے خاندانی نظام کی ایسوسی ایشن

اقوامِ متحدہ کی شائع کردہ ایک کتاب میں بچوں کے حقوق کی کانفرنس کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے: ''بچوں کے جداگانہ حقوق کا ایک نیا تصور: حکومتوں کو والدین سے بچوں کے تحفظ کی ذمہ داری سے مبرا تعبیر کیا ہے''۔

اب یہ نیا تصور ہی لیجیے جو خاندانی زندگی کے بارے بنیادی فطری حقوق کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے، جن کے تحت والدین کو اپنے بچوں کی پرورش کے حق سے ہی محروم کردیا گیا ہے۔ دراصل بچوں کے حقوق کی کانفرنس (CRC 1989) بنیادی طور پر امریکی قانون دانوں کی تخلیق ہے' جن کے بچوں کی خودمختاری بارے دلائل اجتماعی امریکی قانونی برادری کا ایک کثیر طبقہ ۸۰-۱۹۷۰ء کی دہائی میں مسترد کرچکا تھا۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکا نے آج تک CRC کو نہیں اپنایا۔ گو کہ بہت سے ممالک نے CRC کو قبول کرلیا ہے۔ اِن ساری باتوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم سادہ لوح حکومتوں کی ذہنیت کو سمجھ پائے ہیں جس کے پس منظر میں یہ سوچ پنہاں ہے کہ لفظ حقوق پر مشتمل کسی بین الاقوامی معاہدے کو قبول نہ کیا جائے۔ CRC سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مقامی حکومتوں کی سادہ لوحی کے استحصال کے لیے اقوامِ متحدہ کا فورم استعمال کرنے کا گُر سیکھ لیا ہے۔ انہی متحرک گروہوں نے انسانی رشتوں پر اپنے انتہاپسندانہ نظریات پر بین الاقوامی قانون کی مبہم مگر معروف اصطلاحات کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔

مگر یونانی دیومالا سے تشبیہات مستعار لی جائیں تو یہ صورت یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ ان گروہوں نے لکڑی کا دیومالائی ٹروجن گھوڑا ایجاد کرلیا ہے جس نے انھیں کسی بھی ملک کے نظامِ قانون اور اُس کی ثقافت میں بغیر پکڑائی دیے در آنے کے قابل بنا دیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کا خواتین اور مامتا بارے اندازِ فکر اس مسئلے کی موجودگی کی واضح دلیل ہے۔ ابھی حال ہی میں سامنے آنے والی اقوام متحدہ کی دستاویزات پرکھی جائیں تو اِن میں آزادیٔ نسواں کی انتہاپسند تنظیموں کے اِس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ مامتا، مردوں کی حاکمیت مسلط کرنے کا ایک جابرانہ تصور ہے۔

مثال کے طور پر بہت سے ممالک مامتا کا تحفظ اقوامِ متحدہ کی قرارداد برائے انسانی حقوق مجریہ ۱۹۴۸ء کے مطابق کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ مامتا خصوصی تحفظ کی حقدار ہے۔ لیکن اب صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ اقوام متحدہ کے قوانین کے استحصال کے خاتمے کا کمیشن ان تحفظاتی اقدامات کو مردوں کی برتری کا ذریعہ سمجھتا ہے جو مامتا کے فرسودہ تصور کو فروغ دیتے ہیں اور اِس طرح خواتین کو اپنے کام کاج میں احساسِ شرکت و کامیابی سے محروم کرتے ہیں۔

ہاورڈ یونیورسٹی کی میری این گلینڈن اس متعصب زاویۂ نگاہ کے بارے کہتی ہیں: ''خواتین اُس وقت تک بھرپور ترقی نہیں کرسکتیں جب تک اُن کے خاندان میں کردار کو سراہا نہیں جاتا یا قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔''

گذشتہ پانچ صدیوں کے دوران آج ہم ایسے موڑ پر کھڑے ہیں کہ خاندان بارے رویوں اور قوانین میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ فرانسس فوکویاما آج کے دور کے خاندانی انتشار کو ایک جامع خرابی و تباہی کا مرکزی حصہ گردانتے ہیں جن خاندانی ناطوں کو لوگ باہمی محبت وخلوص کا باعث سمجھتے تھے۔ اب وہ غلامی کے طوق دکھائی دینے لگے ہیں۔

بڑی اور ہمہ گیر قوتیں اور اثرات اب انفرادی امن، محبت اور انسانی وابستگیوں کو تیزی سے ختم کر رہی ہیں اور جو نظریات والدین کو آپس میں اور بچوں کو والدین سے جوڑے رکھتے تھے اب کافی حد تک ماند پڑ گئے ہیں۔

پیٹرایشا ہالینڈ کہتی ہیں: ''اگر مجھے معاشرے کو تباہ کرنے کو کہا جائے تو میں اِس کے لیے قوانین پر بھرپور یلغار سے

آغاز کروں گی۔'' ان باتوں سے کیا مراد ہے؟ غالباً پیٹرایشا ہمیں خواتین اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ توانائیوں بارے بتا رہی ہیں۔ بالخصوص خواتین کے اچھے معاشرتی کردار بارے' جس کو ہم اب کمزور اور نظرانداز کر رہے ہیں۔ خواتین نے تو مضبوط دیواروں میں استعمال ہونے والے سیمنٹ کا کردار ادا کیا ہے جس کے باعث ہمارے عزیز تر رشتے بشمول ازدواجی رشتے اور والدین اور بچوں کے آپس میں جڑے رہتے ہیں لیکن اب ہمیں اس دیوار میں واضح دراڑیں دکھائی دے رہی ہیں جو اِس بات کی دلیل ہیں کہ ہم حقائق سے پہلوتہی کرتے رہے ہیں۔

جدید معاشرے نے تو خاص طور پر خواتین کے اہم معاشرتی کردار کے حوالے سے تربیت کو نظرانداز کیا ہے۔ آیئے ہم سب سے پہلے مامتا کے بارے میں بات کرتے ہیں، جدید معاشرے کی بے قدری کے تناظر میں۔

اگر مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو لفظ 'مامتا' عزت و توقیر، ایثار اور خلوص و محبت سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اگر ہم لفظ بے لوث کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ خواتین اپنا باطنی تشخص اور ذات کی نشوونما سے دستبردار ہو جائیں تو ایسا سوچنا بالکل غلط ہوگا۔ بدقسمتی سے آج کے دور کی آزادیِ نسواں کی سوچ کسی اور طرف نکل گئی ہے اور خواتین کو اپنے خاندانوں سے مکمل طور پر آزاد اور جدا دیکھنے کا تصور پیش کرتی ہے۔ بلکہ سب سے معقول نظریہ یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس ضمن میں ''دی چرچ یسوع مسیح آف سیٹر دے سینٹس'' کی حال ہی میں جاری کردہ تصنیف The Family A Proclamation to the World میں ازدواجی زندگی کے بارے میں اچھی مثال دی گئی ہے۔ اِس تصنیف کے مطابق میاں بیوی برابر کے ساتھی ہیں' جو ایک دوسرے کی اپنے اپنے انفرادی کرداروں کو نبھانے میں مدد کرتے ہیں۔ واقعتاً کامیاب شادی دونوں پارٹنرز کی انفرادی ترقی کے مواقع بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔

ناقدین نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے خواتین کو دو انتہاؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جہاں ایک طرف خودمختاری و مکمل آزادی تو دوسری طرف خاندان یا شوہر پر مکمل انحصار ہے۔ درمیانہ راستے کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ایثار اور خودغرضی دونوں انتہائیں ایک طرف، مائیں تو اُس درمیانے راستے کی مسافر ہوتی ہیں جو راستہ اپنی خوشی سے خدمت کرنے کا راستہ ہے اور جو خواتین کی شخصیت کو نکھار دیتا ہے۔

اس درمیانی راستے کو نظرانداز کرنا سراسر زیادتی ہے۔ ان زیادتیوں کے نتیجے میں مامتا کی قدر و منزلت بارے مباحثوں نے جنم لیا ہے جس کی رُو سے معاشرے میں خواتین بالخصوص ماؤں کی قدر و منزلت میں خاص کمی ہوئی ہے۔

امریکی قوانین کی عزتِ نفس تو بہت ہی نچلی سطح تک جا چکی ہے۔ باوجود اِس کے کہ خواتین کو گذشتہ ۳۰ برسوں میں کئی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ آیئے اِس کی وجہ جاننے کی کوشش کریں۔ ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف مردوں کے جبر کے خلاف علَم بغاوت بلند ہوا ہے، بلکہ قوانین کے خلاف بھی بغاوت کی صورت حال ہے۔ ایک مصنف کا کہنا ہے کہ وہ کام کاج جو بلند حوصلہ خواتین ادا کرتی تھیں مثلاً سماجی خدمت، تدریس و تعلیم، نرسنگ بلکہ مامتا بھی ان بلند حوصلہ کاموں میں شامل ہے، اب درجہ دوئم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ دراصل مامتا کی قدر گھٹانے والوں نے خواتین کے اچھے کاموں میں معاشرے کا کلیدی کردار اور نمایاں کارناموں و کامیابیوں کو بھی ماند کر دیا ہے۔ اِس کے برعکس اگر ایک ماں کو اپنے شوہر، خاندان اور معاشرے کی طرف سے حوصلہ افزائی ملے تو ایسی ماں خود کو ایک باحوصلہ اور پُرامید ماں محسوس کرتی ہے۔ اور پُرامید ماں نئی نسل میں اُمید کی کرن پیدا کرتی ہے اور یہ پُرامید بچے پُرامید معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔

جدید معاشرے کی اِن خوبیوں نے معاشرے میں جنسی بے راہ روی سے بچاؤ کے لیے خواتین کے اعلیٰ کردار کو بھی زک پہنچائی ہے۔ وفاداری کا سالہا سال سے رائج تصور خواتین میں جنسی بے راہ روی کے خلاف ایک خودکار سسٹم کی حیثیت رکھتا تھا۔ بالکل ایسے ہی جس طرح کوئی باطنی/اندرونی قطب نما یا فطری مقناطیس ہو، جس کا رُخ شمالِ کامل کی طرف ہو۔ ایسی تشبیہ کے تناظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح شدید دھچکے یا نقصان سے فطری مقناطیس اپنی طاقت کھوسکتا ہے، بالکل اسی طرح خواتین بھی ایسی صورت حال میں اپنی فطری اخلاقی مقناطیسیت کھوسکتی ہیں۔

بہرحال خواتین تاریخ کے دھارے میں جنسی اخلاقیات کے بنیادی اساتذہ کا کردار بخوبی نبھاتی رہی ہیں۔ خواتین نے اُن ثقافتی دوہرے معیار اور ناانصافیوں کو ایک عرصے تک برداشت کیا ہے جو مردوں کو ایک سے زائد پارٹنرز سے جنسی تعلقات (بالخصوص ناجائز) کی اجازت دیتے ہیں لیکن خواتین میں ایسی خصلت کو برداشت نہیں کرسکتے۔

ماہر عمرانیات ڈیوڈ پوپے نو کہتے ہیں:

> ''دنیا بھر میں مرد جنسی عمل کی طرف راغب دکھائی دیتے ہیں جب کہ خواتین عمر بھر والے رشتوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ دوہرے معیار جو مردوں میں غلط رجحانات کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، عدم مساوات اور ناانصافیوں پر مبنی ہیں۔ معاشرے کو چاہیے تھا کہ ان خرابیوں کا مقابلہ اس طرح ہوتا کہ مردوں کو بھی خواتین کی طرح جنسی یا ازدواجی وفاداری کا پابند بنایا جاتا۔ لیکن اِس کے برعکس ہماری موجودہ نسل نے یکسر غلط راستہ اپنا لیا ہے اور خواتین اور مردوں میں مساوات قائم رکھنے کے لیے خواتین میں مردوں جیسی جنسی مادر پدر آزادی کا پرچار شروع کر دیا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اِس سارے عمل کا فائدہ اٹھانے والے بچے اور خواتین ہیں۔''

اب ہم اِس بے قدری کے تیسرے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں۔ اب یہ عالم ہے کہ معاشرے نے خواتین میں مستقل ازدواجی رشتوں کی باطنی خواہش کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ نتیجتاً یہ سماجی ملبہ اٹھائے پھر رہے ہیں۔ جو جنس، عورت، مرد اور ازدواجی رشتوں بارے موجود منتشر سوچ کا شاخسانہ ہے۔

دو ماہرین اِن حالات کو شادی کے بندھن کا مکمل زوال گردانتے ہیں جس کے نتیجے میں خاندانی عدم استحکام میں اضافہ ہوا ہے اور والدین کی بچوں میں دلچسپی اور توجہ میں خاطرخواہ کمی آئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خواتین میں ازدواجی استقلال کی خواہش سیمنٹ کی سی حیثیت رکھتی ہے جو معاشرتی استحکام کی اینٹوں کو آپس میں مضبوطی سے جوڑے رکھتا ہے اور جب یہ مضبوط ہوجاتی ہے تو خاتونِ خانہ ایک فطری مقناطیس کا کردار ادا کرنے کے قابل ہوجاتی ہے جس کی کشش ثقل خاندانی یکجہتی بالخصوص شوہر سے ہم آہنگی کے مرکز کی سی صورت اختیار کرجاتی ہے۔ اِس کیفیت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ خاتونِ خانہ اپنے خاندان کی کائنات کی اخلاقی بلندی کا مرکز بن جاتی ہے۔ کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے: ''مضبوط مائیں مضبوط گھر بناتی ہیں جب کہ باپ اور اُن کے بیٹے محفوظ ہمسائیگی ممکن بناتے ہیں''۔

دراصل خواتین کو قدرت نے انسانی رشتوں کی آبیاری کی صلاحیت سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ تازہ ترین تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ خواتین رشتوں کو قائم و دائم رکھنے کے لیے کسی بڑی کامیابی کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ جبکہ اِس کے برعکس مرد حضرات کسی کامیابی کے لیے رشتوں کو قربان کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔

خواتین کے لیے برابری کی جدوجہد کرنے والے انتہاپسند عناصر اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ خواتین کا خاندان یا معاشرے کی اخلاقی، سماجی اور ثقافتی تعمیر میں کوئی کردار ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عورت اور مرد میں تفریق کرنے سے خواتین منفی اور امتیازی سلوک سے مزید دوچار ہوں گی جن سے خواتین کا معاشرے میں کردار نچلی سطح پر چلا جائے گا۔

خواتین کے حقوق کی تحاریک نے گذشتہ کچھ برسوں کے دوران خواتین کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں اور بہت سے مردوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ یہ خواتین کی رشتوں کے تقدس کے لیے قربانیوں کا استعمال کرتے رہے ہیں لیکن ماضی کے عورت و مرد میں مساوات و عدم مساوات کے درمیان معلق تحاریک ہمارے رویوں کو بہت دُور تک لے جاچکی ہیں جس کے نتیجے میں معاشرے کی طرف مامتا جنسی یا ازدواجی وفاداری، شادی اور خواتین کی انفرادیت کی حوصلہ افزائی کے عمل کو نقصان پہنچا ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم رویوں کی ان معلق سوئیوں کو واپس جانب شمال لے جائیں اور اپنے بچوں اور معاشرے کی نشوونما خواتین کے پُراثر اخلاقی کردار سے کریں۔

یقیناً معاشرہ خواتین کی اپنی صلاحیتوں اور فطری رجحانات کے فروغ کے لیے ان کی خوداعتمادی میں اضافہ کر کے اُن کے وجود کو معنی دے سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں مرد حضرات کو بھی اِس بات پر آمادہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی ماؤں، بیویوں اور بیٹیوں کی قدر کرسکیں اور اِن کو اچھی معاونت دے سکیں۔ ہم تو پہلے ہی بڑے مشاہدات اور تلخ تجربات کے بعد اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خواتین اور بچے بلکہ سارا معاشرہ وسیع تر بگاڑ کا شکار ہوجاتا ہے اگر ہم عورت مرد مساوات کے حصول کے لیے خواتین میں بھی مردوں جیسی آزادانہ جنسی روش کی حوصلہ افزائی کریں۔

ہماری یہ عالمی کانگریس جنیوا اور دوسری ان تمام جگہوں پر جہاں خاندان بارے پالیسی بنانا مقصود ہو۔ اِس بات کی متمنی ہے کہ عورت مرد مساوات کے سلسلے میں ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ تاکہ خواتین کا فطری اخلاقی اثر ورسوخ محفوظ بھی رہے اور جس سے معاشرہ بھرپور استفادہ بھی کرسکے۔

بے شک مساوات اچھی چیز ہے اور اِسے برقرار بھی رہنا چاہیے لیکن اِس کے لیے ہمیں مرد حضرات سے اپیل کرنی ہے کہ وہ خواتین کی اخلاقی برتری کی تقلید کریں۔ اِس کام کے لیے مردوں کو شادی کے بندھن اور زندگی بھر کے نبھا کے عہد کی پاسداری کرنی چاہیے۔ صرف ایسے خوش آئند حالات اور نظریاتی ہوشمندی سے ۲۱ویں صدی کی یہ دنیا مساوات، تہذیب وتمدن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔[۲]

ڈاکٹر نکولاس ایبرٹیڈٹ کا خطاب

ڈاکٹر نکولاس ایبرٹیڈٹ (Dr. Nicholas Eberstadt)[۳] نے ''آبادی میں اضافہ یا مستقبل میں آبادی کی کمی کا خطرہ'' کے موضوع پر اپنے خطاب میں کہا کہ عالمی کانفرنس میں شرکا نے زور دیا کہ جہالت میں ڈوبے شماریات کے ماہرین پر زور ڈالا جائے کہ وہ دنیا کو آنے والی صدی میں آبادی کے مسائل سے آگاہ کریں۔ مجھے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہم اِس

۲۔ مصنف ایلڈر بروس سی ہفن جے ڈی، چرچ آف جیسزس کرائسٹ کے رکن ہیں اور برگھم ینگ یونیورسٹی کے لاسکول میں ڈین رہ چکے ہیں۔ اُن کی اپنی اہلیہ میری کے بطن سے ۷ بچے ہیں۔

۳۔ مصنف واشنگٹن ڈی سی کے امریکن انٹرپرائزز انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اُنھوں نے لندن سکول آف اکنامکس اور ہارورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

قابل نہیں، نہ ہی ہمارے پاس اتنے قابلِ اعتماد راستے ہیں کہ پتہ چل سکے کہ کتنے انسان آیندہ پیدا ہوں گے۔ میں صرف ایک تصویر کشی کرسکتا ہوں۔ آنے والی صدی میں عالمی دنیا کی آبادی کی انتہا ہوگی اور اس کے بعد بہت زیادہ کمی، یہ صورت حال انتہائی مناسب ہے۔

آئیں پہلے ۲۰ویں صدی میں آبادی کے پھیلاؤ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اندازاً ۱۹۰۰ء بعد سے اب تک دنیا کی آبادی چار گنا ہوگئی ہے۔ یعنی انیسویں صدی میں ۱ء۶ ارب تھی اور اب تقریباً ۶ ارب ہے۔ دنیا کی آبادی اِس صدی میں اتنی نہیں بڑھی کیوں کہ انسانوں نے خرگوش کی طرح بڑھنا شروع کر دیا ہے۔ آبادی نے ایک دم بڑھنا شروع کردیا ہے اور مکھیوں کی طرح مرنا بند کردیا ہے۔ ہماری صدی میں زندگی کا بچنا دُگنا ہوگیا ہے۔ اس کے برعکس انیسویں صدی میں اوسط عمر ۳۰ کے اردگرد تھی اب اوسط عمر ۶۵ کے لگ بھگ ہے۔

یہ صحت مندی کا بڑھتا ہوا تناسب آبادی کے بڑھنے کی بڑی وجہ ہے لیکن اِس صدی کے آخر میں صورت حال شاید اِس سے مختلف ہو۔ ہم گواہ ہیں ایک ایسی تحریک کے جس کا آغاز فرانس میں ہوا کہ آہستہ آہستہ شرح افزائش نسل کو کم کیا جائے۔ یہ تحریک اصل میں ۲ سال قبل شروع ہوئی جو اَب ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔

۱۹۹۸ء میں ۴۴ فی صد کی آبادی دوسرے ملکوں میں جا کر آباد ہوئی، تاہم بہت ساری جگہوں پر جہاں بچے دوسرے ملکوں میں پیدا ہوتے ہیں، اِن میں آبادی کی شرح ڈرامائی طور پر کم ہے۔ بہت تیزی سے کم ہوتی افزائش نسل کئی جگہوں پر حیران کن ہے۔ ایران میں بھی ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں شرح پیدائش کم ہوئی ہے۔ ایک خاتون کے ہاں اب سات کی بجائے اوسطاً ۳ بچوں کی پیدائش ہوتی ہے۔

ماضی میں عالمی آبادی کی اوسط عمر ۲۰ سے ۲۵ سال تھی جو کہ اَب ۲۶ سال ہے۔ لیکن ۲۰۵۰ء میں اوسط عمر عالمی آبادی کی ۴۲ سال ہوگی۔ زیادہ ترقی یافتہ علاقوں میں اوسط عمر ۵۰ سال ہوگی۔ اس کا مطلب ہوا کہ ۵۰ سال سے پہلے کی عمر کے لوگ ۵۰ سال سے بڑے بھی ہوسکتے ہیں جو چند لوگ ہوں گے۔ تاہم بعدازاں دنیا کا نقشہ بدل جائے گا اور بڑی واضح تبدیلی آجائے گی۔

زیادہ عمر کے لوگوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ پنشن کے بوجھ کو بھی بڑھائے گا۔ ایک تناسب ۶۵ سال کی عمر کے لوگوں کا اور اس سے بڑی عمر کے لوگ جو کہنے کو کام کی عمر ہے، یہ ریٹائرمنٹ کی عمر کو ۱۵ سے ۶۵ کر دے گی۔

جاپان میں ہر سو لوگوں میں سے کم از کم ۷۰ لوگ ایسے ہیں جو ۶۵ سال سے بڑے ہیں۔ پنشن کا نظام اِس طرح کی عمر میں کیسے چلے گا، یہ ایک واضح سوال ہے۔ یہ سوال اور اہم ہوجاتا ہے جب پنشن کا بوجھ غریب ملکوں پر پڑے گا اور صورت حال کو گھمبیر کردے گا۔

میں اعتراف کرتا ہوں ایک عام سماجی سائنس دان میرے تصورات اتنے پھیلے ہوئے نہیں ہیں جو اِس قسم کی دنیا کا اِدراک کرسکیں۔ لیکن میرے تصورات ناخوش گواری کے ساتھ بھی چیک کیے جاسکتے ہیں کیوں کہ ممکنہ تخفیف آبادی جس کا میں نے نقشہ کھینچا ہے جو اگلے ۴۰ سال کے بعد واقع ہوگا۔ اِس کا مطلب ہے کہ زیادہ تر لوگ جو اِس وقت دنیا میں زندہ ہیں وہ میری بات کا تجربہ کریں گے اِس تخفیف آبادی کا اور اِس کے ساتھ جینا سیکھ لیں گے۔ جغرافیائی جنات کی آوازیں کل کے انسان کی تخفیف کریں گی۔

ربائی ڈینئیل لیپن کا خطاب

ربائی ڈینئیل لیپن[۴] نے ''خدا کے بندوں کے لیے شادی شدہ ہونا معنی رکھتا ہے'' کے موضوع پر کانگرس کے سامنے اپنے خطاب میں کہا کہ اقوامِ متحدہ کی ۲۳ سالہ تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ اگلی مردم شماری نئی نسل کے متعلق بہت سارے سوالات پوچھنے جا رہا ہے۔ لیکن اِس میں ایک بھی سوال شادی شدہ زندگی کے لیے نہیں ہے۔ خاندانی نظام کے خلاف طاقتیں بالآخر جیت گئیں۔ انھوں نے پوری ثقافت کو قائل کیا کہ نسلی علاقے بہت زیادہ اہم ہیں بہ نسبت اس کے کہ آپ اپنے آپ کو پارٹنر یا بچوں کے لیے وقف کر دیں۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں ہوئی، کئی سالوں میں ہم بتا رہے ہیں کہ ہر چیز جو ہم کرتے ہیں وہ ہماری جینیاتی مخصوص صفت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جو لوگ شراب پیتے ہیں وہ اپنے کردار کی کمزوری کی وجہ سے نہیں پیتے بلکہ جینیاتی وجہ سے الکوحل کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ ناگزیر ہے کہ وہ پئیں۔ ہم کو یہ بھی بتایا گیا کہ اگر آپ جواری ہیں تو اپنے آپ کو قصوروار کیوں ٹھہرائیں یا یہ سوچیں کہ تم فطری طور پر بیمار ہو اور تم کو جینیاتی مسائل ہیں۔ اِن سب کو ماہرین گردانا جاتا ہے جو کہ سائنس اور علم کی نسبت پروپیگنڈہ زیادہ کرتے ہیں بہ نسبت سائنس کے۔ وہ کہتے ہیں Genetics (Gens کی Study) ان کی تقدیر ہے۔ آپ کے جینز (Genes) آپ کو بالکل ویسا کرنے کو کہتے ہیں جو آپ میں کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہم کو حتیٰ کہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ہم جنس پرستی بھی غیر معمولی عمل نہیں ہے بلکہ یہ بھی جینز کے ماتحت ہے۔ کتنا عجیب ہے کہ بیالوجی ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم جوا کھیلیں، شراب پئیں اور الکوحل ادویات کا استعمال کریں۔ یا پھر ہم جنس پرستی کو بھی سائنس کا نام دیں لیکن یہ تجویز نہیں کرتے کہ ہم شادی کریں، سچائی سے رہیں۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ بیالوجی جس پر ہم اعتماد کرتے ہیں کہ اس میں عقل و دانش ثابت ہوتی ہے۔ اُسی کی وجہ سے ہم سزا بھگت رہے ہیں کہ ہم جو بھی گناہ کرتے ہیں اُس کی جڑ بیالوجی ہے۔

اس غلط پروپیگنڈا کو بھلانا چاہیے اور اِس بات پر زور دیا جائے کہ ایک روایتی صحت مند زندگی گزاری جائے نہ کہ بیالوجی کا غلام بن کر اپنے آپ کو تباہ کیا جائے اور ایک غلط طرزِ زندگی اپنائی جائے۔

اِس غلط طرزِ زندگی سے ہٹ کر معاشرے کے کئی مسائل کا حل اب بھی صرف روایتی خاندان میں ہے۔ مثال کے طور پر غربت ہی طلاق کی بہت بڑی وجہ ہے۔ ہماری جیلیں بھری ہوئی ہیں اور ہمارے عدالتی نظام والدوں کے بغیر پلے بڑھے نوعمر مردوں کے بہیمانہ کارناموں سے اَٹے پڑے ہیں۔ والدوں سے محروم نوعمر خواتین ایسے نوعمر مردوں کی بے راہ روی کا نشانہ بنتی ہیں۔ میری دانست میں روایتی خاندان کی طرف لوٹ کر ہی بہت سی معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ میں تو تجویز کرتا ہوں کہ آنے والے وقت میں اب سے زیادہ دانش مند امریکا کو آج کے دور کے صحت عامہ کے افسران پر شہریوں کو خطرات سے دوچار کرنے کا مقدمہ چلائیں۔ یہ اہل کار سائنس کو چھوڑ کر فیشن کو اپنا چکے ہیں جس سے انسانی جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ بہت سے لوگ روایتی خاندان کو قدر کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتے۔ پریشانی کی بات ہے کہ ہمارے شہر اپنا اچھا مشن چھوڑ کر روایتی خاندان کی بے قدری کی جانب کیوں گامزن ہیں؟ کیا یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ غیر منطقی سوچ کے حامل ہیں۔ کیا ان لوگوں نے موجودہ کانفرنس میں دیے گئے دلائل کبھی نہیں سنے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ

۴۔ مصنف ایک ریڈیو کا میزبان، اور ایک امریکن تحریک 'روایات کی جانب' کا صدر ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کو خاندانی روایات کو مستحکم کرنے اور آزاد تجارت کے لیے راہ نمائی فراہم کرتی ہے۔

روایتی خاندان کے افراد کے غلط اندازے لگانا یا انھیں کمزور یا کمتر سمجھنا فاش غلطی ہوگی۔ یہ لوگ روایتی خاندان کی مخالفت اس لیے نہیں کرتے کہ یہ خاندان سے محروم ہیں بلکہ اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ یہ خاندان والے لوگ ہیں۔ انسانی معاشرے کی تشکیل کے صحیح معنوں میں صرف دو ہی طریقے ہیں:

پہلا طریقہ مرکزیت ہے جہاں ایک مرکزی حکومت اور معاشرے کے ہر فرد میں ایک باہم تعلق قائم ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ معاشرے کی تنظیم خاندان کی صورت میں ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح انسانی دماغ کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس میں لاکھوں باہمی رابطے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اِس دوسری صورت حال میں معاشرے کے عام درمیانی مفاہمت کا رول ادا کرنے والے ادارے آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔

پہلا نظریہ ہمیشہ خاندانی اداروں کی مخالفت کرے گا۔ کیوں کہ اس نے مرکزیت کو ختم کیا ہے۔ یہاں صرف دو راستے ہیں کہ ان تین اہم سوالوں کا جواب ڈھونڈا جائے۔ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور ہم کیا کرنا چاہتے ہیں؟

دوسرا نظریہ ان سوالوں کا جواب کچھ اس طرح دیتا ہے کہ ہم تخلیات میں جیتے ہیں۔ جن کو خدا کی انگلیوں نے چھوا ہے، اس شکل کو تخلیق کیا ہے اور زمین پر ہر ایک کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ ہم اشرف المخلوقات بن کر آئے۔ ہم کو اعلیٰ مقصد کے لیے بنایا گیا، ہمیں کہیں اور اعلیٰ جگہ جانا ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں اُمید ہے اور اُس اُمید کے لیے زندہ ہیں۔ ہم سب کو مل کر یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہاں پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کریں۔

پس ہمارے پاس دو متضاد نظریات، خیالات اور عقیدے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ہم سب خدا کا کنبہ ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ ہم سب صرف جانور ہیں۔ یہ بنیادی فرق ہے دو نظریات میں۔ ایک فطری حل یہ ہے کہ یا تو ایک روایتی خاندان کو قبول کرلیا جائے یا بھرپور طریقے سے چھوڑ دیا جائے۔

فیتھ ڈی انیریٹی کا خطاب

فیتھ ڈی انیریٹی (Faith D. Innerarity) نے ''خاندان کا بین الاقوامی سال ۱۹۹۴ء اور غرب الہند میں خاندان اور شادی کا ادارہ'' کے موضوع پر خطاب کیا۔

خاندان کو معاشرے کا ایک ناگزیر حصہ کہا جاتا ہے۔ یہ سماجی ادارے کی ایک بنیادی اکائی ہے اور اس امر کا تصور بھی انتہائی مشکل ہے کہ اس ادارے کے بغیر انسانی معاشرہ کیوں کر اپنی ذمہ داریاں اور فرائض انجام دے سکتا ہے۔

درحقیقت، بشریات کے متعلق تحقیقی جائزوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر معلوم معاشرے میں خاندان موجود رہا ہے۔ مثال کے طور پر جارج پیٹر مُرڈوک نے 'سماجی ڈھانچہ' نامی ایک جائزے میں چھوٹے چھوٹے شکاری اور اجتماعی معاشروں سے لے کر بڑے بڑے صنعتی معاشروں پر مشتمل ۲۵۰ معاشرے شامل کیے اور حاصل شدہ ثبوت کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان ایک عالمگیر اور آفاقی نوعیت کا حامل ادارہ ہے۔

اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مختلف معاشروں کے لحاظ سے خاندانی ڈھانچے بھی مختلف ہوتے ہیں، ذمہ داریوں اور فرائض کے لحاظ سے ان میں قابلِ ذکر یکسانیتیں موجود ہوتی ہیں۔ روایتی طور پر خاندان پر کئی قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور بنیادی طور پر اس کا کردار، ایک ذمہ دار فرد میں ڈھلنے کے لیے بچوں کی پرورش سے منسلک ہے۔

خاندان، ایک ایسا ادارہ ہے جہاں معاشرے کے نئے ارکان، اس معاشرے کی بنیادی اقدار اور ضوابط کے متعلق علم حاصل کرتے ہیں جس میں انھوں نے پرورش پانا ہوتی ہے۔ یہ 'خاندان' ہی ہے کہ جہاں سے بچے، پہلے یہ سیکھتے ہیں کہ 'صحیح' یا 'غلط' اور 'اچھے' یا 'بُرے' رویے میں کیا فرق ہے۔ اسی خاندان سے بچے یہ بھی سیکھتے ہیں کہ مرد و خواتین پر کون سے ضوابط لاگو ہوتے ہیں، نیز وہ والدین کی اطاعت اور بااختیار افراد کی فرمانبرداری کا سبق بھی یہیں سے سیکھتے ہیں۔

خاندان اور ان کے عزیز رشتہ داروں پر مشتمل گھرانہ، اپنی ضروریات کے لیے محتاج بچوں کی دیکھ بھال، نگہداشت کے علاوہ ان کے لیے رہائش، لباس اور خوراک فراہم کرنے کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خاندان کے ذریعے نہ صرف نوعمر بچوں کے لیے معاونت ونگہداشت بلکہ ضعیف، بیمار اور معذور افراد کے لیے مطلوبہ سہولیات اور خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔

صنعتی انقلاب برپا ہونے سے قبل، خاندان، پیداواری اکائی بھی تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خاندان گھر، ایک 'کارخانہ' بھی تھا، اور افرادِ خانہ، اپنی بقا اور زندگی کے لیے درکار اکثر اشیا تیار کرتے تھے۔ لہٰذا، بچے بھی اپنے والدین سے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے لیے مہارتیں سیکھتے تھے۔

انیسویں صدی کے اوائل ہی سے، پیشہ ورانہ سرگرمیاں، گھروں میں نہیں بلکہ دفاتر اور کارخانوں میں انجام پاتی تھیں۔ اب اپنے لیے درکار اشیا، خاندان، تیار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ منڈی اور بازار جاتے اور اپنی مطلوبہ اشیا خرید لیتے۔ لہٰذا پیشہ وارانہ زندگی کے لیے درکار مہارتیں، اب گھروں میں نہیں بلکہ دفاتر، کارخانوں، کالجوں یا تربیتی اسکولوں میں سے سیکھی جاتی تھیں۔ خاندان کی ذمہ داریوں اور فرائض میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود، معاشرے میں ان کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ وہ خاندان جس میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے، یہ خاندان، ابھی تک ان بے شمار عناصر میں سے واحد انتہائی اہم عنصر ہے جو آیندہ زندگی میں، اس کے مختلف پہلوؤں، مثلاً صحت، تعلیم اور روزگار کے مواقع پر، ابھی تک اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

جدید امریکی معاشرے کے متعلق، اپنے تجزیے میں، ٹیلکاٹ پارسنز، اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب جب کہ خاندان کی چند ذمہ داریاں اور فرائض، دیگر ادارے انجام دے رہے ہیں، پھر بھی، دو بنیادی اور بدستور موجود ذمہ داریاں ایسی ہیں، جو خاندان کے دائرۂ اثر میں شامل ہیں، مثلاً ایک بالغ/ ذمہ دار شخصیت میں بنیادی سماجی اقدار اور معیارات کی سرایت اور ان کا استحکام۔

''خاندان کے بین الاقوامی سال'' نے دنیا بھر کی توجہ 'خاندان' کی طرف دلائی اور اقوامِ متحدہ کے تحت ۱۹۹۰ء کی دہائی میں منعقد ہونے والے مختلف اجلاسوں، مثلاً عالمی سماجی سربراہی اجلاس کے ذریعے، خاندان کی اہمیت کے لحاظ سے مخصوص حوالوں کے ذریعے سے اسے تقویت بخشی گئی۔ جمیکا جیسے وسیع غرب الہندی معاشرے میں، ''خاندان کے بین الاقوامی سال'' نے خاندان کی اہمیت کے لحاظ سے عوام کی توجہ اور آگہی اُجاگر کرنے میں کردار ادا کیا اور خاندان کی متعلقہ سرگرمیوں کے تناظر میں مختلف اداروں کے درمیان اشتراکِ عمل میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا۔ قومی ترقی کے لیے حکمتِ عملیوں کے ایک حصے کے طور پر خاندان کو استحکام اور مضبوطی عطا کرنے کے ضمن میں بھی مختلف حکمتِ عملیوں اور منصوبوں کا ازسرنو جائزہ لیا گیا اور انھیں عملی شکل میں ڈھالنے کے لیے مفید طریقے اختیار کیے گئے۔ ان میں سے خاص اہمیت کی حامل، تعلیم عامہ کی

مہم تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ معاشرے کے اپنے ارکان، خاص طور پر بے بس اور محتاج افراد، مثلاً بچوں، معذوروں اور ضعیفوں کے کردار کو اُجاگر کیا جائے۔ اس مہم کے ذریعے گھرانوں میں مثبت اقدار کو فروغ دیا گیا اور مختلف معاشروں اور اداروں کی طرف سے گھرانوں کو معاونت مہیا کی گئی۔

خاندان کے مسائل و معاملات کی طرف عالمی توجہ مبذول کرانے کے حوالے سے نومبر ۱۹۹۹ء میں جنیوا میں منعقد خاندان کے متعلق دوسری عالمی کانگرس، ایک اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔

غرب الہند کے ایک خاندان کی زندگی، ان متعدد یکساں اہم تعلیمی اور عملی مسائل کو پیش کرتی ہے جو امریکا میں موجود افریقی امریکی خاندانوں پر لاگو ہوتے ہیں۔

غرب الہند کے ایک خاندان کے اہم مسائل کے سلسلے میں ''ماں پر مشتمل خاندان اور باپ کا عدم کردار'' یہ دو ایسے حالیہ نظریات ہیں جو غرب الہند کے خاندان کا تجزیہ کرتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ ان نظریات کے ساتھ 'واحد والدین' کا مسئلہ منسلک ہے۔ غرب الہند کی مجموعی خاندانی صورتِ حال کے جائزے کے ذریعے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک تہائی گھرانوں کی سربراہ خواتین ہیں، اور بعض علاقوں میں یہ شرح مزید زیادہ ہے۔ اس خاندانی ڈھانچے کے لحاظ سے، بہرحال، مندرجہ ذیل اختلافی امور منسلک ہیں:

i- مائیں، اپنے بچوں کی تن تنہا پرورش کرتی ہیں۔

ii- ایک ماں کے، اپنے ایک ساتھی یا کئی ساتھیوں کے ساتھ عارضی تعلقات ہیں، لیکن اس گھر میں باپ کے نام کی کوئی مستقل شخصیت موجود نہیں ہے۔

iii- وہ ماں جو اپنے بچوں کے ساتھ اپنے وسیع شاندار گروہ کے ساتھ رہتی ہے، عام طور پر اس میں اس کی اپنی ماں یا نسوانی رشتے دار شامل ہوتے ہیں۔

مؤخر الذکر مثال، اس صورت حال کو ظاہر کرتی ہے جب ازدواجی خاندان کی غیر موجودگی یا ناکامی کے باعث غیر ازدواجی خاندان پر انحصار کیا جاتا ہے۔

اپنے گھروں میں عدم دستیابی کے باعث جمیکا اور غرب الہند کے دیگر مردوں کو ان کے اس طرزِ عمل کی توجیہہ کے لیے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے لیکن ان میں 'غیر ذمہ دار' اور 'دھوکے باز' زیادہ معروف ہیں۔ عمومی طور پر ان منفی رویوں کے باعث مردوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس موضوع پر کھلے عام اور نجی طور پر بہت زیادہ بحث کی جاتی ہے۔ مزید برآں، ان کے باعث، غرب الہند میں مردوں کے متعلق بہت سے نظریات تبدیل ہوگئے ہیں۔ ایک متنازع نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مرد، غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ معاشرے کے باعث وہ اپنا کردار ادا نہیں کر سکتے اور وہ اپنے خاندان سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس علاقے میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق یہ امر نہایت واضح ہو چکا ہے کہ باپ کا کردار، خاندان کے لیے معاش (آمدن) فراہم کرنے سے منسلک ہے۔ چونکہ باپ کے تصور کی حیثیت سے معاشی عنصر، اس قدر مرکزی اہمیت کا حامل ہے کہ خاوند اور باپ کا منصب اور حیثیت، بالآخر اسی عنصر کے ذریعے ہی متعین کی جاتی ہے۔ یہ مرد جس قدر زیادہ مفلس اور نادار ہوتے ہیں، خاندان میں اس قدر زیادہ ہی ان کا کردار کم اور غائب ہوجاتا ہے، اور خاندان میں اسی قدر زیادہ خواتین کا

کردار بہت زیادہ اور اہم ہوجاتا ہے۔

حالیہ سالوں میں ایک نئی دلچسپ پیش رفت یہ ہے کہ بچوں کی ایک کثیر تعداد، واحد باپوں کے ہاتھوں پرورش پا رہی ہے۔ اس امر کے بھی اشارے مل رہے ہیں کہ عمومی طور پر بچوں کی دیکھ بھال، نگہداشت اور خواتین کے لیے مخصوص گھریلو کام کاج میں مرد، زیادہ سے زیادہ شریک ہورہے ہیں۔

تمام غرب الہند میں گھریلو سطح پر غریب گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ بچے ہوتے ہیں جس کے باعث دولت مند خاندانوں کی نسبت، ان کا تعلیمی معیار بہت ہی کم ہوتا ہے۔ ایک جوہری خاندانی ڈھانچے کی غیر موجودگی کا غربت کے ساتھ نہایت قریبی تعلق ہے۔ ان میں وہ گھرانے شامل ہیں وہ واحد والدین (عام طور پر خواتین سربراہ ہوتی ہیں) پر مشتمل ہیں یا جن خاندانوں میں مرد یا عورت کے والدین گھر کے سربراہ ہوتے ہیں۔

اکثر غریب خاندان گنجان آبادی میں رہتے ہیں جہاں مناسب رہائش، صحت عامہ اور دیگر سہولیات کا فقدان ہوتا ہے۔ اگرچہ علاقائی لحاظ سے غرب الہند میں غیر صحت بخش خوراک، ایک اہم بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ یہ امر تو نہایت واضح ہے کہ بعض غریب گھرانوں میں غذائیت بخش خوراک کی عدم فراہمی کی شرح بہت زیادہ ہوسکتی ہے۔ اکثر اوقات، اس کے باعث بچے پر زندگی بھر کے لحاظ سے ایسے مستقل اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ اس کے لیے غربت کے چکر سے نجات ممکن نہیں ہوتی۔

شہری علاقوں میں، خاص طور پر، وہ گھرانے غربت کا شکار ہیں جن کی سربراہ خواتین ہیں۔ اس کی وجہ، بہت زیادہ بے روزگاری، کم معاوضہ اور بچے کی پیدائش پر مبنی سرگرمیوں کے باعث پابندیاں بیان کی جاتی ہیں۔

دستیاب ثبوت کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے کہ غرب الہند کے علاقے میں، خاص طور پر، شہری علاقوں کے رہنے والے نوعمر اور بڑے بچوں میں جرم کی شرح بڑھ رہی ہے۔ خاندان میں ٹوٹ پھوٹ اور عدم استحکام (طلاق، علیحدگی، واحد والدین پر مشتمل خاندان، باپ کی طرف سے غیر مؤثر اور غیر ذمہ دارانہ کردار) کو اکثر و عام طور پر، بچوں/ جوانوں میں بے راہ روی کا ایک اہم سبب قرار دیا جارہا ہے۔ گرینڈا میں مرتب کیے گئے ایک جائزے کے مطابق، جس میں قیدیوں کے سماجی و معاشی کے پس منظر کا مطالعہ کیا گیا، یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان میں سے زیادہ تر نوعمر/ جوان تھے جن کی عمریں ۱۵ سال تک تھیں۔

پیٹرک جے فیگان کا خطاب

پیٹرک جے فیگان نے عقیدے اور خاندان کے تعلق کا امریکا کے تناظر میں جائزہ پیش کیا۔ گذشتہ کئی نسلوں سے امریکی خاندان میں موجود جذبہ، شدید آزمائش کا شکار رہا ہے اور واضح طور پر اس جذبے میں کمی واقع ہورہی ہے۔ اس قدر زیادہ تعداد میں امریکی خاندان علیحدگی کا شکار ہوتے ہیں یا ابتدائی عرصے میں وہ اپنی خاندانی زندگی برقرار رکھنے میں ناکام ہوجاتے ہیں کہ امریکی خاندانی تاریخ میں ایسی مثال پہلے کہیں موجود نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے نے جس میں ۱۹۶۰ء کی دہائی سے ہی ایک خطرناک شرح سے مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے ٹوٹ پھوٹ کا شکار گھروں اور گھرانوں، نوعمر بچوں میں جنسی تعلقات کا عظیم میلان، شادی کے بغیر پیدائش کی انتہائی بلند شرح، اسقاطِ حمل میں کمی کے حوالے سے ناکامی اور زیادہ سے زیادہ واحد اور طلاق یافتہ ماؤں کو غربت کے گڑھے میں گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ عمرانیات پر مبنی مواد، جائزے اور تحقیق کے ذریعے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ خاندانی نظام میں ناکامی، اور بچوں کی غربت میں

اضافے، نوعمری میں بے راہ روی، بچوں کے ساتھ زیادتی وظلم، کمزور اور گھٹیا تعلیمی کارکردگی، منشیات کی عادت اور صحت کے متعلق مسائل کے مابین، ہمیشہ سے ہی ایک باہمی تعلق موجود رہا ہے۔

اس صورت حال سے، جسے میں ''استرداد اور اجنبیت کا معمول و ماحول'' کا نام دیتا ہوں، تمام امریکی متاثر نہیں ہیں۔ درحقیقت، اعداد وشمار کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر، ایک پائیدار اور مستحکم شادی شدہ زندگی بسر کرنے والا خاندان، کسی بھی دیگر خاندانی استمام کی نسبت، اپنے بچوں کو ہمیشہ ہی زیادہ سے زیادہ دولت، بہت زیادہ خوشی، بہتر سے بہتر صحت اور تعلیمی مواقع اور اضافی استحکام فراہم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، اس گھرانے کو روحانی فوائد بھی زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ جو گھرانے اکٹھے عبادت کرتے ہیں، زیادہ پائیدار اور مستحکم زندگی گزارتے ہیں اور اپنی آیندہ نسلوں کو وہ زیادہ سے زیادہ فوائد اور ازدواجی زندگی کے اخلاقی اصول منتقل کرتے ہیں جن کے ذریعے امریکا کی جمہوری اقدار اور معمول، ہمارے سامنے آتا ہے۔

آزادی کے حوالے سے امریکا میں موجود شاندار معمول کی بنیاد، متحرک ثقافت میں گھُندے ہوئے ایک ایسے خاندان پر ہے جہاں بچے کے دونوں حیاتیاتی والدین اسے اپناتے ہیں، اس کے ساتھ محبت و پیار کا سلوک کرتے ہیں اور اس کی نہایت احتیاط کے ساتھ پرورش کرتے ہیں۔ لیکن ''استرداد اور اجنبیت کا معمول و ماحول'' اس بنیاد کو کمزور وکھوکھلا کر دیتا ہے۔ اگرچہ، اس صورت حال میں تبدیلی کے کچھ حوصلہ افزا اشارے نظر آنا شروع ہوگئے ہیں لیکن ''استرداد اور اجنبیت کے معمول و ماحول'' کے باعث پہنچنے والا نقصان نے، جیسا کہ آپ عمرانیات کے حوالے سے ذیل میں درج گفتگو کے ذریعے دیکھیں گے، خاص طور پر غریب گھرانوں میں، وسیع پیمانے پر اپنی حشر سامانیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

''استرداد اور اجنبیت کے اس معمول و ماحول'' کو تبدیل کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے آہنی ہاتھ کے استعمال سے زیادہ مؤثر اقدامات کی ضرورت ہوگی کیوں کہ اکثر، زیادہ تر بحرانوں سے نمٹنے کے لیے حکومت کی طرف سے ایسے ہی اقدامات کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ حکومت کے پاس کوئی ایسے طریقے اور افرادی قوت نہیں ہے کہ جن کے ذریعے وہ ایک مستحکم شادی کے حوالے سے والدین کے درمیان محبت و پیار، وفاداری اور عزم و ارادہ پیدا کر سکے۔ بہرحال، حکومت ایک خاندان کے معاون دیگر سماجی اداروں ـــــ خاص طور پر چرچ اور عقیدے کی بنیاد پر قائم سکولوں، والدین اور گھرانے کو براہِ راست اور بلاواسطہ معاونت فراہم کرنے والے، ماہر اداروں کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کے علاوہ ان کو مدد فراہم کر سکتی ہے یا ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ سکتی ہے۔ حکومتی سطح پر اور معاشرے میں موجود سرکردہ افراد اور قائدین کو چاہیے کہ وہ ان اداروں کو اپنے فرائض و ذمہ داریاں انجام دینے کے ضمن میں مدد، حمایت اور حوصلہ افزائی مہیا کریں۔ عام طور پر انھیں ابتدا ہی میں روک لیا جاتا ہے۔

اس نئی صدی میں، امریکا اور باقی دنیا کے سامنے یہ مشکل صورتِ حال درپیش ہے کہ معیشت میں بہتری رونما کرنے کے بجائے خاندانی نظام اور خدا پر ایمان، جیسے عناصر کو مستحکم کیا جائے۔ گذشتہ صدی میں عمرانیات نے متعلق تحقیق کے ذریعے ظاہر ہونے والے بصیرت افروز افکار کو مختصر انداز میں بیان کرنے کا سادہ طریقہ، ہمارے اس موقف پر مشتمل ہے کہ بچے ایک خاندان کے ذریعے ہی پرورش پاسکتے ہیں، اور یہ خاندان اس وقت مستحکم اور مضبوط بنیاد پر قائم ہوتا ہے جب یہ مستحکم شادی کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے، اور یہ شادی اس وقت پھلتی پھولتی ہے جب فریقین باقاعدہ عبادت کے عادی ہوتے ہیں۔ اس موقف اور نظریے کی حمایت میں مہیا ہونے والی ثبوتوں کی کثیر تعداد کے باوجود، باپ، ماں اور بچوں کی طرف سے ایک

دوسرے کے لیے استرداد اور نفرت کا رجحان، ناقابلِ قبول حد تک مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے، دس بچوں میں سے صرف چار بچے، ایک مستحکم، شادی شدہ خاندان کے ساتھ منسلک رہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسے خاندان میں رہتے ہیں جہاں ان کے والدین، باہمی طور پر اور اپنے بچوں کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ ایک تہائی بچوں کو پیدائش سے قبل ہی مسترد کر دیا جاتا ہے، اور ایک تہائی بچے غیر شادی شدہ ماں کے ہاں، باپ کے بغیر پیدا ہوتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ نصف کی تعداد میں وہ بچے، جو شادی شدہ والدین کے ہاں پیدا ہوتے ہیں، اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے، اپنے والدین کو، ایک دوسرے کو مسترد کرتے ہوئے دیکھیں گے۔

امریکی تاریخ میں، اس سے پہلے، بچوں اور گھرانوں پر اس قدر مشکل وقت آن نہیں پڑا۔ قومی استحکام کے باوجود، خاندانی نظام کے لحاظ سے امریکا، سماجی طور پر کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ بہرحال، امریکیوں کو یہ توقع ہے کہ ان کے بچے ''استرداد اور نفرت کے ماحول'' میں پرورش پائیں گے جو اس کے سماجی، سیاسی اور قانونی اداروں کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ خاندانی، قانونی، تعلیمی، ابلاغی، پیشہ وارانہ اور حتیٰ کہ چرچ اور عبادت گاہوں کے لحاظ سے، جہاں سے اکثر وبیشتر شادی کا آغاز ہوتا ہے، اور اسے ہمیشہ ہی نہایت قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے، کے لحاظ سے، مرد وخواتین کا باہمی طور پر، اپنے خدا کے سامنے، اور اپنے معاشرے کے لیے، تعلق اور وابستگی، کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

اگر ریاست، اپنے سب سے بنیادی ادارے، شادی شدہ خاندان کے خلاف ہوجاتی ہے تو پھر یہ ریاست اپنی قوم کی تشکیل کی بنیاد، ان سچائیوں کو بھی جھٹلا رہی ہوتی ہے جن کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم خطرناک حد تک ایک بحران کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی اشرافیہ کا ایک طاقتور طبقے کے نزدیک اب اس معاشرے میں شادی اور عبادت کے لیے کوئی قابلِ عزت مقام موجود نہیں ہے۔ ہماری حکومت تو آگے بڑھ کر، والدین کا کردار تو ادا کرنے کی خواہاں ہے، حالانکہ اس کے پاس بچوں اور بڑوں کی طرف سے پیار ومحبت، شفقت اور وفاداری پیدا کرنے کے حوالے سے کوئی آئینی اختیار موجود نہیں ہے۔ اس وقت خاندان، چرچ اور سکول میں اس قدر صلاحیت و جوہر موجود ہے کہ ان تینوں اداروں کے ذریعے ایک مستحکم ومضبوط معاشرے کی تعمیر نو کا کام، اب لازمی طور پر شروع ہوجانا چاہیے۔

اب مقامِ شکر ہے کہ اب اکثر نوعمر بچے، اس پیغام پر کان دھرنے لگے ہیں۔ وہ ان سماجی برائیوں کو دُور کرنے کے آغاز کر رہے ہیں جو گذشتہ تین دہائیوں کے دوران واقع ہوچکی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم بڑے بھی، اپنے بچوں کی پیروی کے لیے تیار ہیں؟ امریکا میں ''چوتھی بیداری'' کے متعلق گفتگو ہوتی رہی ہے جو پروٹسٹنٹ امریکا کی تاریخ میں اہم مذہبی احیاؤں کا ممکنہ تسلسل سمجھی جاسکتی ہے۔ اگر ایسی، یا اس سے مختلف صورت حال جلد ہی پیدا نہیں ہوتی تو جس امریکا کو ہم ایک طاقتور، پُرامن ریاست سمجھتے ہیں تو پھر جلد ہی یہ قوم، ہماری یادوں اور کہانیوں ہی میں محفوظ رہ جائے گی۔

بچوں کے حقوق پر کے ایس ہائموونز کا خطاب

کے -ایس ہائموونز جو کہ نیویارک کے مین ہیٹن انسٹی ٹیوٹ کے سینئر فیلو نے امریکا میں بچوں کے حقوق کا ذکر کرتے ہوئے کہا: تاریخی لحاظ سے حقوقِ اطفال کا تصور، امریکا میں بے شمار مختلف انداز اور طویل عرصے سے ہی موجود ہے اور اس کے چند ابتدائی ادوار ایسے ہیں جن پر امریکا کو فخر محسوس کرنا چاہیے۔ بہرحال گذشتہ ۳۰ برس سے، حقوق اطفال کے علَم برداروں نے ایک غلط موقف اپنا رکھا ہے، جسے ایک طبقہ ''غیر مطلوبہ نتائج و اثرات'' کا نام دیتا ہے، ان میں سے کچھ کے

متعلق، میں آپ کے سامنے اپنے خیالات پیش کروں گا۔

۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں، حقوق اطفال کے بارے میں یہ نقطۂ نظر کہ ظلم و زیادتی اور ان کی انسانی حیثیت تسلیم نہ کرنے کے خلاف ان کے تحفظ، اور ان کی محتاجی و بے کسی کا احساس اور ان کے لیے بڑوں کی طرف سے راہ نمائی، ایک نئے نقطۂ نظر میں ڈھل چکا تھا۔ اس نئے نظریے کی رُو سے حقوقِ اطفال کے علَم برداروں نے بچوں کو بڑوں کے تسلط (زبردستی) سے آزاد رکھنے کے لیے آواز بلند کی اور بچوں کے متعلق اس تصور کہ وہ ایک بے بس اور محتاج مخلوق ہیں، کو بدلنے کے لیے کوشش شروع کی۔ انہی دہائیوں میں ہیلری کلنٹن سمیت متعدد سماجی تنقید نگاروں نے بچوں کے لیے آزادیٔ مزید کے لیے دلائل کا انبار لگا دیا۔ لیکن یہ موقف ۱۹۶۷ء میں ہی ایک تحریری قانون کی شکل اختیار کر سکا جب امریکی سپریم کورٹ نے In re Gault نامی ایک مقدمے کا فیصلہ کیا۔ یہ مقدمہ ۱۹۶۴ء میں اس وقت شروع ہوا جب ریاست اریزونا کے شہری جبرالڈ گالٹ نامی ایک لڑکے کو بچوں کی عدالت کے سامنے ایک فحش فون کرتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا اور اصلاحی سکول میں بطور سزا چھ سال کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ فیصلہ نہایت ہی مبہم اور جلد بازی پر مبنی تھا۔ جبرالڈ کے والدین نے ریاست اریزونا کے خلاف امریکی سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ یہاں ججوں نے نہ صرف ایک پندرہ سالہ لڑکے کو اس جرم کے لیے چھ سال کے لیے غیر منصفانہ طور پر قید کرنے کے معاملے پر گہری توجہ مبذول کی کہ اگر وہ صرف تین کا ہوتا تو اسے زیادہ سے زیادہ پچاس ڈالر جرمانہ ہوسکتا تھا۔ سپریم کورٹ نے یہ سب اقدامات اس قدر ڈرامائی انداز میں اٹھائے کہ بچوں اور بڑوں کے درمیان روایتی .....امتیاز ختم ہونے کا آغاز ہوگیا۔

بظاہر یہ ایک ہمدردانہ اور مشفق فیصلہ معلوم ہوتا تھا، اور صرف لوگوں کی ایک قلیل تعداد ہی ایک فحش فون کرنے پر چھ سال کی قید کی سزا کو درست سمجھتی سکتی تھی، لیکن سپریم کورٹ نے ان حالات میں ایک ایسا فیصلہ دیا جس نے ''بچوں کی عدالت'' کی رُوح کو زخمی کر دیا۔ بچوں کی عدالت، جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ صدی کے اوائل میں قائم ہونے والی اس عدالت کا مقصد محض سزا دینا تھا اور یہ کوئی ایسا سماجی ادارہ نہیں تھا جو بچوں کو سدھار سکے اور انھیں راہ نمائی فراہم کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ معمولی جرائم مثلاً ریل گاڑیوں میں سے کوئلہ اکٹھا کرنے کے مرتکب بچوں کو بھی ان عدالتوں میں پیش ہونا پڑا جہاں بڑے اور اہم جرائم، مثلاً گھڑچور، قاتل، حتیٰ کہ آبروریزی کرنے والے مجرم پیش ہوتے تھے۔ اس قسم کے سلوک میں پوشیدہ خطرات اور اس امر کا احساس کہ ۱۷ سال کے کم عمر افراد کے ساتھ مختلف رویہ اپنانا چاہیے، ایک جج کو یہ ادراک اور آگہی حاصل کرنا پڑی کہ وہ ایک ''عقل مند والدین'' کا کردار ادا کرے۔ اس طرح ججوں نے نوعمر بچوں کو سخت سزا دینے کے بجائے بچے کے بہترین مفادات کو مدنظر رکھنا شروع کر دیا۔ اس قسم کے رویے کے باعث والدین نے بھی لچکدار رویہ اپنانا شروع کر دیا، مثلاً کیا ان کے بچے نے اس سے پہلے اس قسم کا کوئی جرم کیا، اور کیوں؟ بچوں کے لیے گھر کا ماحول کیسا ہے؟ کیا اسے اس ظالم گھر سے دُور رکھنے کی ضرورت ہے، یا اسے محض راہ نمائی چاہیے؟

حقوقِ اطفال میں وسعت پیدا کرتے ہوئے، سپریم کورٹ نے اس تصور کو متعارف کروایا کہ ایک نوجوان شہری کی حیثیت سے ایک بچے کو ریاست کی طرف سے بچاؤ درکار ہے، اور اس طرح، اس بچے کا تصور زائل کر دیا جسے ریاست کی طرف سے تحفظ درکار تھا۔ جو بچہ، اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے، خود پر فخر محسوس کرتا ہے ـــــ وہ ایک آزاد ـــــ لیکن بعض اوقات ایک ایسا شہری ثابت ہوتا ہے جس کی کوئی بھی مدد نہیں کرنا چاہتا۔

ایک نابالغ لڑکی کی طرف سے حقِ اسقاط حمل کے بارے سپریم کورٹ کے فیصلے کے باعث، حقوقِ اطفال کے متعلق وہی، بلکہ کچھ زیادہ ہی غلط مفروضات پیدا ہوجاتے ہیں جن کے اس طرح تکلیف دہ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

ہم 'غیر مطلوبہ نتائج' کے ضمن میں ایک مثال کا مشاہدہ اس لحاظ سے کرسکتے ہیں جب نابالغوں کو ضرورت سے زیادہ حقوق عطا کردیے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جنگ ویت نام کے خلاف احتجاج کے موقع پر ایک سکول کے اساتذہ اور بچوں نے اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھی۔ مقامی اسکول کے پرنسپل نے بچوں سے کہا کہ وہ یہ پٹیاں اُتار دیں۔ ان میں سے ایک پندرہ سالہ جان الف ٹنکر نے سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا جس نے اس بچے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جج، ایبے فورتاس نے اکثریت کی طرف سے یوں فیصلہ تحریر کیا: ''یہ تو بہت مشکل ہے کہ اساتذہ اور بچوں کو سکول کے پھاٹک پر آئینی طور پر حاصل حق اظہار سے محروم رکھا جائے۔ بچے سکول میں ہوں یا باہر، وہ ہمارے آئین کے مطابق 'افراد' ہیں۔

رچرڈ ولکنز کا خطاب

رچرڈ ولکنز، جو کہ برگھم ینگ یونیورسٹی میں پروفیسر آف لاء اور فیملی پالیسی فورم کے ڈائریکٹر ہیں، نے کہا: جولائی ۱۹۹۸ء میں اٹلی، روم میں ایک اعلیٰ سطحی سفارتی اجلاس کے موقع پر Creation of the International Criminal Court (ICC) کا آئین منظور کیا گیا۔ صرف دو ہفتے قبل، قواعد وضوابط اور مجرمانہ رویے کی تعریف وضع کرنے کے ضمن میں نیویارک میں ابتدائی تیاری کرنے والی مجلس نے دستاویزات کو حتمی طور پر تیار کیا۔[۵]

یہ واقعات، ایک دہائی پر مشتمل، ان کوششوں پر مشتمل تھے جن کا مقصد بین الاقوامی جرائم کے مقدمات چلانے اور بین الاقوامی سیاست[۶] میں ایک پُرتاثیر تبدیلی رونما کرنے کے لیے ایک مستقل عدالتی ادارے کا قیام تھا۔ اس آئین کا مقصد، ایک ایسے عدالتی طریقہ کار کی تخلیق تھا جس کے ذریعے اس روئے زمین پر موجود ہر شخص کو انصاف فراہم کیا جائے خواہ وہ اس ملک کا شہری ہو یا نہ ہو، جو اس آئین سے متفق ہو یا نہ ہو۔ مزید برآں انسانی حقوق کے کئی ایک علَم بردار، شاید اس آئین کو، اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں کے ذریعے متعین کیے جانے، انسانی حقوق کے ایک نظام کو نافذ کرنے کے ضمن میں اہم اور مرکزی ذرائع سمجھیں۔

۵۔ After a series of meetings spanning two years, the Preparatory Commission for the International Criminal Court Completed work on the Rules of Procedure and Evidence (PCNICC/ 2000/L.2/ Add.1) and the Elements of Crimes PCNICC/2000/?L.2/Add.2) on June 30, 2000.

۶۔ The ICC, as conceived, is not formally a part of the United Nations System, Although it will have a close financial relationship with the UN. See, e.g, Manual for the Ratification and Implementation of the Rome Statute, published by the International Centre for Human Rights and Democratic Development (Montreal, Quebec, Canada) and TheInternational Centre for Criminal Law Reform and Criminal Justice Policy (Vancouver, British Columbia, Canada) at 2.

آیا کہ ICC کے قیام کی تعریف کی جائے یا اس پر تنقید کی جائے، یقیناً یہ ایک قابلِ بحث معاملہ ہے۔ اس ضمن میں قانون کے ایک پروفیسر (Rutgers University) راجر ایس کلارک نے مجھ سے کہا کہ اس عدالت کے فوائد کے حوالے سے، اس کے اور میرے نظریات کے درمیان قدرے فرق ہے۔ مزید برآں، جب ہم ممکنہ طور پر کئی معاملات بارے باہم طور پر متفق نہ ہوں، تو اس صورت میں، پروفیسر کلارک کے ساتھ یقینی طور پر متفق ہوں کہ ICC کے فوائد بارے کوئی بھی تنازع، جائز اور منصفانہ نوعیت کا ہونا چاہیے۔

ICC کے عمومی نظریے کی حمایت نہایت ہی آسان ہے۔ بہرحال، ICC کا آئین کے دائرۂ کار میں صرف افسوس ناک اور شرمناک جرائم، مثلاً نسل کشی، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم شامل ہیں۔ ان مقاصد کے خلاف کسی بھی قسم کا استدلال بہت ہی مشکل ہے۔ کوئی بھی ہمدرد اور شفیق انسان، اس دنیا میں انسانیت کے لیے مسائل و مشکلات کے بوجھ میں اضافے کا خواہاں نہیں۔ لیکن صحیح کام کرنے کی خواہش ہی محض کافی نہیں ہے، بلکہ درست کام کو لازمی طور پر درست طریقے کے مطابق انجام دینا چاہیے۔ مجھے خدشہ ہے کہ ICC، اس طرح کا کوئی کام بھی نہیں کر رہی۔

ICC کے موجودہ تشکیل شدہ ڈھانچے کے مطابق، اس کا آئین فیصلہ سازی کے اپنے زیادہ تر اختیارات، ایک سابقہ خودمختار ادارے سے ایک عالمی عدالت کو منتقل کر دیتا ہے جو عالمی سطح کے حوالے سے ہر قسم کے افراد اور تہذیب سے ماورا ہوگی۔ جس کا نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ICC کو اس قدر صلاحیت حاصل ہو چکی ہے کہ وہ ایسی عدالت کے طور پر سامنے نہ آئے جو بنیادی شدید ترین بین الاقوامی جرائم سے نمٹ سکے بلکہ ایک معاشرتی انقلاب کے لیے ایک لائحہ عمل بھی ثابت ہو۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ICC، فیصلہ سازی کے وسیع اختیارات اور ججوں کو منتقل کرتی ہے جو ایک مبہم زبان اور سیاسی طور پر غیر جواب دہ وکیلِ استغاثہ کے ذریعے کام کرتے ہیں۔ قومی خودمختاری میں یہ مداخلت حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین ہے جیسا کہ اس مضمون کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ اس حیرت انگیز آئینی پیش رفت میں کیا یہ امر شامل ہے یا نہیں کہ 'درست کام درست انداز میں انجام دیں'۔ بہت حد تک اس نظریے پر منحصر ہے کہ ملک کی خودمختاری کا احترام ہونا چاہیے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کئی ایک ملکی اور بین الاقوامی قانونی حلقوں میں خودمختاری کے لیے احترام کا جذبہ بہت ہی کم ہے۔ لہٰذا، کیا یہ عدالت، درست کام، درست انداز میں انجام دے رہی ہے' کا انحصار قومی خودمختاری پر ہے جو بذاتِ خود تحفظ کی طالب اور مستحق ہے۔

اب ہم اس تاریخی مقام پر کھڑے ہیں جہاں ایک بین الاقوامی ادارے کو، داخلی، سماجی حکمت عملی میں مداخلت کرنے کا قدیمی اختیار حاصل ہے۔ اس پیش رفت کے حامی بہت ہیں لیکن وہ اقوام، اس نظریے کی حامی نہیں ہیں جو 'انسانی حقوق' کے نام پر اپنی قومی خودمختاری کے اہم[۷] پہلوؤں قربان کرنے پر آمادہ ہیں۔ ایک خطرناک نظریہ اور لائحہ عمل ہے۔ 'انسانی حقوق' کی نسبت، قومی مختاری، ایک ایسا بنیادی عنصر ہے جس کے ذریعے بذاتِ خود اس کے اپنے حقوق قائم اور محفوظ ہونے چاہئیں۔

۷۔ Inter national Covenant on Civil and Political Rights. Article 1, para. 1; International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights, Article 1, para. 1

ایلن سی کارلسن کا تعارف

ایلن سی کارلسن جو کہ خاندان کے موضوع پر کام کرنے کے لیے عالمی شہرت رکھتے ہیں اور انہوں نے خاندان کے ادارے کو بچانے کے لیے عالمی کانفرنسوں کو منعقد کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے بطور صدر Howard Centre for Family, Religion and Soceity مارچ ۱۹۹۷ء میں پراگ (چیک ریپبلک) میں "The World Congress of Families" اور نومبر ۱۹۹۹ء میں جنیوا میں منعقد ہونے والی "The World Congress of FamiliesII" میں بطورِ سیکرٹری جنرل نگرانی کے فرائض سرانجام دیے انہوں نے ۱۹۷۵ء سے اب تک خاندان کے موضوع پر بے شمار خطابات کیے ہیں۔

انہوں نے اوہائیو یونیورسٹی سے جدید تاریخ میں ڈاکٹوریٹ کی۔ وہ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۳ء تک قومی کمیشن برائے اطفال کے رکن رہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں سے چند درج ذیل ہیں:

1 Family Questions: Reflections on the American Social Crisis

2. The Swedish experiment in family politics

3. From cottage to work station: The family's search for social harmony in the Industrial Age

4. The new agrarian mind and: The movement joward decentralist thought in 20th century america

ایلن کارلسن جو کہ قومی کمیشن برائے اطفال کے نگران کے طور پر منتظم اعلیٰ تھے ہمارے ساتھ ورلڈ فیملی پالیسی فورم برگھم ینگ یونیورسٹی امریکہ میں شریک اجتماع تھے۔ انھوں نے اپنے خطبات بھی پیش کیے۔ اسی طرح انھوں نے خاندان کے بارے میں دستاویزات بحث و مباحثہ کے لیے پیش کیے۔ ان کے خطابات کی پوری تفصیل تو نہیں دی جاسکتی، مگر ان کے عنوانات اور مختصر خلاصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

فطری خاندان محاصرے میں

۱۹۳۴ء میں الوا ور گنّار مرڈل نے مشترکہ طور پر ایک کتاب لکھی جس کا ٹائٹل "Kris Befolkningsfragan" (آبادی کا بحران تھا)۔[۸]

سویڈن کی شرحِ آبادی بڑھانے کے بہانے سے کتاب نے سماجی زندگی کی ایک نئی شکل کا ایجنڈا پیش کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ موجودہ خاندانی نظام ''قریب قریب .....'' ''گرفتارِ امراض'' ''بے بنیاد'' اور ''منقطع'' ہو چکا ہے جس کا ''بکھر جانا'' اور ''بانجھ پن'' میں مبتلا ہونا یقینی ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ ایک بنا سوشل آرڈر قائم کیا جانا چاہیے جس میں عورت ایک کامریڈ کے طور پر مرد کے دوش بدوش دہاڑی دار مزدور کی طرح کام کرتی ہو جبکہ بچے اجتماعی ملکیت اور ریاستی ذمہ داری بن جائیں۔ اس سوشل آرڈر میں ''پرائیویٹ زندگی'' اور ''گھر'' کے قدیمی تصورات ختم ہو کر ریاست کی زیرِ ہدایت سماجی منصوبہ بندی اور

۸۔ Full Citation: Alva and Gunnar Myrdal, Kris I Befolkningsfragan (Stockholm: Bonniers, 1934)

باہمی تعاون کے دائرے میں چلے جائیں گے۔ اس سوشل آرڈر کے تصور کے دیگر اجزا میں اسقاط حمل کی ممانعت کے قوانین کو نرم کرنا، مانع حمل دواؤں اور آلات کی آسان اور فوری فراہمی، جنسی تعلیم کو سکولوں کے نصاب کا حصہ بنانا، آبادی کے اہداف اور کنٹرول کو ریاست کی ذمہ داری بنانا اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ بالغوں کے مابین قانونی اور سماجی امتیازات ختم کر دینا شامل تھا۔ الوامرڈل کا استدلال یہ بھی تھا کہ یہ اہداف یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ باقی ماندہ روایتی گھروں کو بھی قانون اور پالیسی کے ذریعے ختم کر دیا جائے اور اس نظریے کے منافی عورتوں کے جتنے بھی کردار (Roles) ہوں ان کے ''خاتمے'' کے لیے جبری طریقے بھی بروئے لائے جائیں۔

کتاب ''آبادی کا بحران'' نے اہل سویڈن کے رویوں اور پبلک پالیسی کی تشکیل نو پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ''مرڈل'' میاں بیوی اس زمانے کی بہت اہم عوامی شخصیتیں شمار ہونے لگے اور ان کی اپنی ''رفیقانہ شادی'' کو ہر سطح کے لوگوں نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں مستقبل کے لیے شاندار نمونہ قرار دیا۔ ان کا براہ راست اثر ناروے اور سویڈن تک جا پہنچا۔ وہاں کی حکومتوں نے آبادی کمیشن قائم کر کے اپنی اقوام کو ان کے نظریات کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا۔

تاہم ایک عشرہ بعد شوہر گنّار اپنی اقوام متحدہ کی نئی ذمہ داریوں میں ہمہ تن مصروف ہو گیا' الوامرڈل نے اپنی نئے سٹائل کی شادی کے بندھن کو ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا۔ ایک روز اس نے نہایت تلخی سے شکایت کی ''گنّار کے لیے اقوام متحدہ کا کمیشن برائے یورپ (ECE) ہی سب کچھ ہے، فیملی اور میں کچھ بھی نہیں'' اس کی بیٹی ''سسلا مرڈلبوک'' کی گواہی کے مطابق ''ان کی بطور زوجین'' بھرپور رفاقت'' اور شراکت کار ختم ہو چکی تھیں'' الوا کا کردارِ زوجیت ''ایک نقاب سے زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔'' اور مرڈل ہوم ''اجنبی، خالی خولی اور محرومِ محبت'' تھا۔[۹]

یہ کھینچا تانی اور بندھن ٹوٹنے کا خطرہ ایک المناک کہانی تھی، جو اب تک چلی آ رہی ہے مگر ۱۹۴۰ء کے عشرے کے جنگ زدہ ماحول میں خطرناک طور پر انہونی بات نہیں تھی، فرق یہ تھا کہ الوامرڈل کو بہت جلد اپنا نظریۂ خاندان پھیلانے کا نادر موقع مل گیا تھا جس میں اس کا حالیہ ذاتی تجربہ بھی شامل تھا، اس نظریے کو عالمی سیاسی کینوس پر منتقل ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

اس نے ۱۹۴۸ء کے اوائل میں جنیوا میں تعینات اقوام متحدہ کے افسروں سے ''شادی شدہ عورتوں کی فالتو توانائی'' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی سماجی اور اقتصادی پریشانیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے بشرطیکہ عورتوں کو روایتی شادیوں کے بندھنوں سے باہر لایا جائے۔ اس کے خیالات نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل لی کو متوجہ کر دیا، جس نے اسے سیکرٹریٹ کے شعبہ سماجی امور کی ڈائریکٹرشپ کی پیش کش کر دی۔

الوامرڈل نے ۱۹۶۰ء کے اواخر میں سویڈیش سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی ایک کمیٹی برائے قیام مساوات کی صدارت بھی کی جس میں قیام مساوات کے لیے منشور تیار کیا گیا، اس منشور کا عنوان تھا ''الوامرڈل رپورٹ'' اس دستاویز میں کہا گیا تھا کہ مساوات کی جُستجو ''معاشرے'' کی طرف سے ایک مسلسل جدوجہد کی متقاضی ہے جبکہ یہ مساوات ان معاملات میں بھی ہونی چاہیے جن میں ''فطرت نے بڑے بڑے اور بنیادی نوعیت کے امتیازات پیدا کر رکھے ہیں۔''

۹۔ Sissela Bok, Alva Myrdal: A Daughter's Memoir (Reading, MA: Addison-Wesley, 1991), P: 202-205

اس نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ان پرانے طور طریقوں کی بجائے تمام افراد کو مشترکہ طور پر مرکزی ریاست پر انحصار کرنا چاہیے۔ اس نے زور دیا کہ شادی ایک امتیازی قانونی، سماجی اور اقتصادی اقدام کی حیثیت رکھتی ہے اس کو بھی ختم کر دیا جانا چاہیے جیسا کہ ''دی الوامرڈل رپورٹ'' میں وضاحت کی گئی۔

''ٹیکس سسٹم کے ذریعے مرد و زن کی مقاربت کی کوئی خصوصی شکل مسلط نہ کی جائے، یہ ہر کسی کے لیے یکساں ہونی چاہیے خواہ اس کی صنف کوئی بھی ہو یا اسے کوئی بھی مرتبہ وحیثیت حاصل ہو۔''

''ہر بالغ مرد وعورت اپنی معیشت کی خود ذمہ دار ہے سابق نظام میں مضمر شادی شدہ حیثیتوں کو ختم کر دیا جانا چاہیے.....''

''اسی طرح یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ (شادی کی بجائے) مقاربتِ مرد و زن کی دیگر اشکال کو بھی تحفظ دیا جائے۔''[۱۰]

پس اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اب وقت ہے کہ اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کو تاریخ، سماجی علوم اور طبعی علوم اور عظیم مذاہب کی مشترکہ سچائی سے مطلع کیا جائے: کہ خاندان ایک فطری اور بنیادی سماجی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جو بطورِ انسان ہماری فطرت میں منقش ہو چکی ہے، اس جڑیں ہماری شادی، دنیا میں نئی زندگی لانے کے عزم، آباؤ اجداد کے احترام اور آگے آنے والی نسلوں کے ساتھ پیار و شفقت کے اندر پیوست ہیں۔

یہ وقت ہے کہ ہم خاندان کے اس تصور کو بین الاقوامی غور وفکر کی مجالس میں بنیادی سماجی اکائی کے طور پر پیش کریں تاکہ اس سے ہماری اقوام کے لیے قانون سازی اور پبلک پالیسیوں میں مناسب رہنمائی میسر آئے۔

۱۰۔ Alva Myrdal, et.al., Towards Equality: The Alva Myrdal Report to the Swedish Social Democratic Party (Stockholm: Prisma, 1972 (1969), P: 17, 38, 64, 82-84